887

مطالعۂ فطرۃ

حصۂ اول

قیل و قال

یعنے

اتحاد مذہب و فلسفہ

مصنفہٗ

محمد فاروق، ایم، ایس، سی (علیگ)

باہتمام محمد علیم اللہ خان منیجر

مطبوعہ مطبع حکیم برہم گورکھپور

تهدیہ

بنامِ جوانانِ نوخاستہ
بصدق و صفا قلب آراستہ

از محمد فاروق

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۵ء

فہرست مضامین



بسم اللہ

(۱)

تمہید

تقریباً بارہ برس کا عرصہ ہوا کہ مین نے مولوی ظفر علی خان کی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" جو ڈاکٹر ولیم ڈریپر کی کتاب کا ترجمہ ہے پڑھی تھی۔ تھوڑا زمانہ ہوتا ہے کہ ہربرٹ اسپنسر کی کتاب "فرسٹ پرنسپلز" کا مین نے مطالعہ کیا تو اُس مین بھی ابتدائی چند باب مذہب اور سائنس سے متعلق تھے، فاضل مصنف نے پہلے مذہب اور سائنس کی غایتون سے علیحدہ علیحدہ بحث کی ہے۔ پھر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ کچھ نہ کچھ اصلیت دونون مین ہے

لیکن دونون مین بہت سی ایسی باتین بھی ہین جنکو انسان مانتا ہے مگر اُن کی حقیقت کو سمجھا نہین سکتا، مثلاً مذہب مین خدا کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے مگر وہ فہم سے بالاتر ہے، اسی طرح سائنس مین مادہ، حرکت، زمانہ وغیرہ ایسی چیزین ہین جنکو ہر شخص تسلیم کرتا ہے مگر اُنکی حقیقت سمجھانے سے سب مجبور۔ بہر کیف جہان مذہب اور سائنس مین بہت سے اختلافات ہین وہان دونون ایک نہ ایک ایسی حقیقت کے اعتراف مین متفق ہین جن کے ادراک سے عقل انسانی بحالتِ موجودہ عاجز ہے۔

مین نے "بحالت موجودہ" کی قید اس لئے لگائی ہے کہ بہت سی باتین جو ایک وقت مین انسانی قیاس سے باہر تھین اب نہ صرف وہ تسلیم کیجاتی ہین بلکہ سمجھی اور سمجھائی جاسکتی ہین۔ غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر بات کا ایک خاکہ اپنے ذہن مین قائم کرتا ہے، جو چیزین خارج مین محسوس ہوتی ہین، اُنکا مُرقع انسان ذہن مین ویسا ہی بناتا ہے جیسا کہ دیکھا ہے۔ جو چیزین دیکھی نہین جاسکتین اُنکا خاکہ ہم اپنے ذہن مین اس طرح قائم کرتے ہین کہ دیکھی ہوئی چیزون کے تصورات کو باہم جوڑ کر ایک نیا تصور بنا لیتے ہین۔ لیکن جس وقت ہم کسی شے کی بابت ایسا تصور قائم کرنے سے

عاجز آجاتے ہین تو کہتے ہین کہ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ مین اس معاملے مین ایک ذاتی تجربہ بیان کرونگا۔

میری عمر آٹھ یا نو سال کی تھی جب مجھے یہ بتایا گیا کہ زمین گول ہے اور گردش کرتی ہے۔ پہلی بات بہت جلد میری سمجھ مین آگئی اگرچہ ابتدا مین یہ خیال ضرور رہا کہ اگر زمین گول ہے تو ہر چیز کو پھسل کر گر پڑنا چاہئے۔ لیکن جب یہ خیال جم گیا کہ زمین کا گولا معمولی گیند کے مقابلہ مین جس سے مین نے گولائی کا تصور حاصل کیا تھا، بہت بڑا ہے، اور کئی میل کے ٹکڑے مین بھی گولائی کی وجہ سے زمین اتنی ڈھلوان نہین ہے کہ چیزین اُسپر سے پھسل جائین تو رفتہ رفتہ زمین کی گولائی کا خاکہ ذہن مین قائم ہوگیا۔

لیکن دوسری بات یعنی زمین کی گردش عرصہ تک سمجھ مین نہین آئی۔ اول تو یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو جو مکانات درخت وغیرہ ہم کو آج پورب مین نظر آتے ہین اُنھین دوسرے روز پچھم مین آجانا چاہئے۔ اسکا سبب یہ تھا کہ زمین کے گولے کو ذہن مین گردش دیتے وقت مین اپنے کو اُس سے علیحدہ خیال کرلیا کرتا تھا، اور اسوجہ سے زمین پر کی تمام چیزین گردش کی وجہ سے میرے اپنے وجود کے لحاظ سے اُلٹی پلٹی معلوم ہوتی

تھین - ایک عرصہ کے مشق تصور مین یہ مشکل رفتہ رفتہ حل ہو گئی اور یہ بات سمجھ مین آگئی کہ جب تک مین خود زمین کے ساتھ وابستہ ہون اور اُسکی گردش مین شریک ہون اُسوقت تک چیزون کی سمت مین کوئی فرق نہین آئیگا -

دوسری دشواری جو گردش زمین کے سمجھنے مین حائل ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ زمین کا نصف چکر ہو چکنے کے بعد تمام چیزین جنکو ہم اسوقت اوپر خیال کرتے ہین نیچے آجاتی ہین اور زمین سے اس طرح اُلٹی لٹکتی نظر آتی ہین جس طرح چھت سے چھپکلی یا درختون سے چمگادر - ہم خود اس طرح چلنے پھرنے کا کوئی تجربہ نہین رکھتے اسلئے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو زمین سے چھوٹ کر گر جانا چاہئے - یہ دقت زمین کو گول سمجھنے مین بھی پیش آتی ہے کہ جو لوگ اس کرے کے دوسری جانب ہونگے وہ کیونکر زمین پر قائم رہ سکتے ہین - اس دشواری کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جہان ہم اسوقت قائم ہین اسکے لحاظ سے سر کی سمت ہم اوپر سمجھتے ہین اور قدم کی طرف نیچے فرض کرتے ہین اور اُسی خط کو بڑھا کر اور زمین کے اندر گزار کر دوسری طرف لیجاتے ہین تو وہان جس انسان کو زمین پر قدم رکھے ہوئے ہم پاتے ہین وہ اُلٹا معلوم ہوتا ہے - یہ بات صحیح ہے کہ ہماری بلندی اور پستی کے لحاظ سے وہ

لوگ زمین پر اُلٹے چلتے ہیں لیکن اُنکے لحاظ سے ہم لوگ بھی تو اُلٹے چلتے ہیں
حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہم زمین پہ چلتے پھرتے ہیں اُسکے اعتبار سے ہم نے
سر کی سمت کا نام بلندی اور قدم کی سمت کا نام پستی رکھا تھا لیکن بعد کو
یہ اعتباری حیثیت بھولکر بلندی و پستی کی مستقل صورت ہم نے ذہن میں
قائم کرلی اور روزمرہ کے تجربہ کی بنیاد پر یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ ہر چیز اوپر سے
نیچے کو گرتی ہے۔ پس جب اپنے مقام سے ہم زمین کی دوسری جانب کا
خیال کرتے ہیں تو بے اختیار ذہن میں یہ تقاضا شروع ہوتا ہے کہ اُس جانب
کی چیزوں کو زمین سے چھوٹ کر گرجانا چاہئے۔ بخلاف اسکے اگر چیزوں کے
زمین پہ گرنے کا تصور اس طرح قائم کیا جائے کہ زمین ہر اُس چیز کو جو اُس سے
علیحدہ ہے اپنی طرف کھینچتی ہے اور کسی چیز کو اپنے سے جدا ہونے سے روکتی
ہے تو تمام دشواریاں خودبخود حل ہو جاتی ہیں۔ زمین کی کشش کا وجود چونکہ
آنکھوں سے دکھلائی نہیں دیتا ہے اس لئے ابتدا میں اس قسم کا تصور
قائم کرنے میں دقت پیدا ہوتی ہے لیکن رفتہ اس کشش کا ایک مثالی
خاکہ پیدا ہو جاتا ہے اور گردش زمین یہ آسانی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔
باوجود ان مراتب کو طے کرنے کے اگر یہ کہا جائے کہ زمین کی گولائی

چوبیس ہزار میل ہے، اور آفتاب زمین سے تیرہ لاکھ گُنا بڑا ہے اور زمین آفتاب سے نو کروڑ میل کے فاصلہ پر ہے اور اُسکے گرد چکر لگاتی ہے تو کبھی اس مفہوم کی صحیح صورت جیسی کہ خارج مین واقع ہے ذہن مین نہین پیدا ہوگی بلکہ جو صورت پیش نظر ہوگی وہ محض ایک مثالی ڈھانچہ ہوگا۔

اسکا سبب صاف ظاہر ہے کہ ہماری نگاہ کی وسعت محدود ہے۔ ہم نے نہ تو کوئی گولا چوبیس ہزار میل کا دیکھا ہے نہ ہماری نگاہ اتنی لمبائی چوڑائی مین پھیل سکتی ہے، اس لئے گردش زمین کا تصور کرتے وقت کسی معمولی گولے کو جس کو ہم نے دیکھا ہے اپنے خیال مین اُس سے ایک بڑے گولے کے گرد چکر کھاتا ہوا دیکھتے ہین اور یہ فرض کر لیتے ہین کہ واقعی زمین اور آفتاب اس سے بہت بڑے ہین یہانتک کہ زمین کی گولائی چوبین ہزار میل ہے اور آفتاب اُس سے تیرہ لاکھ گُنا بڑا ہے۔ علی ہذا القیاس زمین اور آفتاب کے فاصلہ وغیرہ کو بھی فرض کر لیتے ہین۔

اب اگر ہم غور سے دیکھین تو ہمارے تصورات کا بیشتر حصہ ایسا ہی ہے، یعنی جن باتون کو ہم خیال کرتے ہین کہ ہم نے سمجھ لیا یا دوسرونکو بتانے یا سمجھانے کی کوشش کرتے ہین اُسکی واقعی صورت ہمارے ذہن

مین موجود نہین ہوتی بلکہ مختلف تصورات کو باہم نسبت دیکر ایک مثالی خاکہ تیار کر لیتے ہین - یہ خاکہ جتنا ہی مضبوط اور واضح ہوگا اُتنا ہی نفس واقعہ ہماری سمجھ مین زیادہ آئیگا اور جتنی دشواری اُسکے قائم کرنے مین پیدا ہوگی اُتنی ہی وہ بات سمجھ سے دُور رہوگی -

یہ کہنا کہ مذہب اور سائنس دونون مین بعض باتین مثلاً خدا یا زمانہ وغیرہ ایسی ہین جنکے سمجھنے سے ہم اپنے کو عاجز پاتے ہین گویا یہ تسلیم کرنا ہے کہ ذہن مین ہم ان چیزونکی کوئی صورت ایسی نہین قائم کر سکتے جو اُنکے خارجی وجود کا واقعی یا مثالی نمونہ کہی جا سکتی ہون - لیکن اسکے یہ معنے نہین ہین کہ ہمارا ذہن ہمیشہ کسی ایسے تصور کے قائم کرنے سے عاجز رہیگا، زمین کی گردش کی جو مثال دی گئی ہے اُس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ تصور کی مشق سے اکثر باتین جو ابتدا مین سمجھ مین نہین آتین رفتہ رفتہ سمجھ مین آنے لگتی ہین - ابتدا مین مثالی مرقع سامنے آتا ہے لیکن اگر مشق تصور جاری رکھی جائے تو حقیقی صورت کا بھی سامنے آجانا محال نہین ہے جیسا کہ ارباب بینش سے پوشیدہ نہین -

اب مین پھر اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہون - یعنی مذہب اور سائنس کے درمیان کیا واقعی کوئی اختلاف موجود ہے یا نہین؟ اور اگر ہے تو اُسکی

نوعیت کیا ہے اور دونون مین سے حق کسکی جانب ہے؟ بنی نوع انسان کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے اور ہر ملک مین یہ اختلاف موجود پایا گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ انسان نے ہمیشہ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ فلسفہ اور مذہب کو متحد کرکے ایک ایسی حقیقت کو پیش کردے جس پر دونون ایمان لانے پر مجبور ہون - اس کشمکش مین کبھی فلسفہ نے مذہب سے تمرد کیا اور کبھی مذہب نے فلسفہ سے منھ پھیر لیا، مذہب کے سامنے فلسفہ مردود اور فلسفہ کے سامنے مذہب دعوی بے دلیل قرار پایا - پھر بھی دونون ایک ہی منزل مقصود کے راہی ایک ہی حقیقت عظمیٰ کے متلاشی اور ایک ہی معشوق کے عاشق ناکام ہین، مگر دونون اپنی اپنی جستجو سے نہ باز آتے ہین نہ باہمی رقابت کا خاتمہ ہوتا ہے -

انسان اگر صرف اپنے حالات پر غور کرے تو مذہب و فلسفہ دونون کی ابتدا، دونون کے باہمی مناقشات اور پھر دونون کی غایت کا ایک ہونا صاف نظر آجاتا ہے سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ ہمارے اندر مذہب کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟ اس مین کوئی شبہ نہین کہ بحالت موجودہ جو کچھ ہمارے مذہبی عقائد ہین اُنکا بیشتر حصہ وہ ہے جنکو گھر کے بڑے بوڑھون سے سنکر

ہم نے باور کر لیا ہے۔ لیکن ان عقائد کو باور کر لینے اور ان سے تشفی حاصل ہونے کی آخر وجہ کیا ہے؟ اس سبب کی تلاش ان مذہبی عقائد مین نہ کرنا چاہیے جو تقلیدی طریقہ پر ہم کو حاصل ہوگئے ہین بلکہ خواہ ہماری تشفی وتسکین عارضی ہو یا دائمی اسکا راز ہماری اُس طبیعت مین ہے جو رموز فطرت کی جویا اور حقیقت اشیا کی مُتلاشی ہے۔ اصطلاح صوفیہ مین اسی کو "طلب" کہتے ہین، یہ طلب انسان سے زائل نہین ہوتی، البتہ کبھی اسکا تقاضا شدید ہوتا ہے اور کبھی دوسری خواہشون سے جن کو ضروریات انسانی، فطرت حیوانی، یا قوت بہیمیہ سے تعبیر کرتے ہین، مغلوب ہوکر کمزور ہوجاتی ہے لیکن کبھی فنا نہین ہوسکتی، اس لئے کہ اولین فطرت انسانی ہے۔

اب اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو یہی طلب معرفت دراصل ہمارے تمام فلسفہ کی بھی بنیاد ہے اور تمام ذخائر علوم وفنون جو ابتدائے تاریخ انسانی سے آج تک جمع ہوئے ہین یا آئندہ جمع ہونگے وہ اسی تلاش حقیقت کے فطری تقاضا کا نتیجہ ہین جس سے انسان مجبور ہے اور جس کیطرف کلام پاک نے ان الفاظ مین اشارہ کیا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ؕ یعنی جن اور انسان کو ہم نے صرف عبادت کے لئے پیدا کیا۔ خالق کی جو غایت

ہے وہی مخلوق کی فطرت ہے، کوئی عبادت معرفت کے سوا نہین ہے اور حقائق اشیار کی تلاش اپنے نفس کی حقیقت شناسی پر مجبور کرتی ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یعنی "خودشناسی ہی خدا شناسی ہے"۔ مذہب ہو یا فلسفہ طلب ہی سے دونون کی ابتدا ہے اور معرفت ہی دونون کی غایت ہے، اختلافات اور مناقشات کا باعث وہ کیفیات درمیانی ہین جنکو اہل تصوف "حجابات" سے تعبیر کرتے ہین، یعنی نادانی اور ناکامی کسی نے خوب کہا ہے:۔

حرم و دیر کے جھگڑے ترے پیچھے سے پڑے
تو اگر پردہ اُٹھا دے تو توہی تو ہو جائے

پھر بھی ایک صاحب نظر کی نگاہ مین یہ جنگ لطف سے خالی نہین ہے، وہ جانتا ہے کہ پردہ اُٹھنے پر کیا تماشا نظر آئیگا۔ ع

ہست از پس پردہ گفتگوی من و تو — چون پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

اب چند الفاظ مین مین "طلب" اور "تشفی" کی باہمی نسبت سے بحث کرنا چاہتا ہون۔ اگر کسی مذہبی عقیدہ یا فلسفیانہ استدلال سے ہماری تشفی ہو جاتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کہ "طلب" کبھی فنا نہین ہوتی اور اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس تشفی کی تحقیق کرین۔ مین اسموقع پر

پھر اپنا ذاتی تجربہ بیان کرونگا۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن مین مجھے بتایا گیا تھا کہ خدا نے سب چیزون کو بنایا ہے۔ اُسوقت پیدا کرنے کا کوئی مفہوم میرے ذہن مین موجود نہین تھا، اسلئے مین "بنانے" کا تصور ویسا قائم کیا جیسا کہ مٹی یا گوندھے ہوئے آٹے سے بچے چڑیا وغیرہ بناتے ہین۔ زیادہ تر یہ خیال اسلئے بھی قائم ہوا تھا کہ یہ سمجھایا گیا تھا کہ ہر چیز مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ یہ خیال میرے لئے اُسوقت تشفی بخش تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ مین جب یہ معلوم ہوا کہ آسمان و زمین سب کچھ "اللہ میان" نے بنایا ہے تو مجھے اپنے تصور مین تبدیلی کرنی پڑی اور مین نے یہ سمجھا کہ اللہ میان کے پاس کوئی بہت بڑا غار مٹی سے بھرا ہوا ہے جس سے انھون نے اتنی بڑی زمین بنائی ہوگی۔ دراصل مین اس مفہوم کے سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ عدم محض سے کوئی چیز وجود مین آئی ہو اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دشواری ہمیشہ ایک نہ ایک صورت مین ہر غور کرنے والے کو لاحق ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ عذاب و ثواب بہشت و دوزخ، ملائکہ، عرش و کرسی وغیرہ کے متعلق تھوڑا بہت سمجھنے کے قابل ہوا تو مین نے اللہ میان کو اُس گہرے رنگ کے پردے سے باہر نکالا جس کے پیچھے بیٹھے ہوئے وہ مٹی کے ہاتھی گھوڑے

اونٹ بیل وغیرہ بنابنا کر دنیا مین بھیجتے تھے - واقعہ یہ ہے کہ میرے گھر مین مرمت وغیرہ کے لئے جب مزدور لگائے جاتے تھے تو دالان مین ایک نہ ایک جا جم سے پردا گھیر لیا جاتا تھا اور اُسی کی آڑ مین عورتین گھر کے کام دھندھے دیکھتی تھین - مین چونکہ نہ خدا کو نہ اُسکے فعل تخلیق کو دیکھ سکتا تھا اس لئے ذہن مین اس قسم کے پردے کا خیال خود بخود پیدا ہو گیا تھا - بہرکیف گوشۂ تنہائی سے نکل کر اللہ میان کی حالت بالکل بدلی ہوئی تھی - وہ ایک زبردست اور جابر زمیندار کی حیثیت سے تخت پر متمکن تھے، خود بہت کم مٹی وغیرہ چھوتے تھے بلکہ سب کام فرشتون سے لیتے تھے، میرے اور اُنکے درمیان آسمان حائل تھا جس کے اوپر اُنکی خاص رعایا اور ملازم یعنی ملائکہ چلتے پھرتے تھے اور موقع موقع سے ہم سے چھپا کر ہم لوگونکے کام بنایا بگاڑا جایا کرتے تھے - دنیا مین آکر کام کرنے کا وقت مین نے اُن لوگونکے لئے رات کا مقرر کر دیا تھا، جب سب سو جایا کرتے ہین -

مین اُن سب جزوی تفصیلات کو اس جگہ نہین بیان کرنا چاہتا جو میرے ذہن نے وقتاً فوقتاً پیدا کئے ہین - ہر شخص اگر اُسے لڑکپن سے ابتک کے خیالات محفوظ ہین تو وہ معلوم کر لیگا کہ اُسکا خدا پہلے کیا تھا اور اب

کیا ہے؟ اور جو انقلابات اُسکے تصور مین ہوئے ہین اُنکے اسباب کیا ہین؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک وقت مین ایک واقعہ کو دیکھتے ہین اور بہ تقاضاے "طلب" اسکی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہین، پہلی نگاہ مین بعض اسباب سامنے آتے ہین اور ایک خاکہ قائم ہوتا ہے جس سے عارضی تشفی ہوجاتی ہے لیکن زیادہ زمانہ نہین گذرتا کہ اس سبب کے سبب کی تلاش ہوتی ہے، ہمچنین مسلسل سلسلۂ اسباب ختم ہوتا ہے نہ مسبب الاسباب کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنان باقی

یہ حالت مذہبی اور فلسفی دونون پر یکسان گذرتی ہے، اور اسی مشاہدہ کے بعد مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون کہ "کوئی مذہب ایسا نہین ہے جسکا فلسفہ نہو اور کوئی فلسفہ ایسا نہین ہے جسکا مذہب نہو" اس لئے کہ اگر مذہب بعض عقائد یا اصول کو بغیر دلیل کے مان لینے کا نام ہے تو تمام فلسفیانہ دلائل کی بنیاد ہمیشہ چند ایسے اصول پر ہوتی ہے جو بغیر کسی دلیل کے تسلیم کئے جاتے ہین علیٰ ہذا القیاس اگر فلسفہ ایسے اصول کے مجموعہ کا نام ہے جو انسان کے تجربہ اور دلائل عقلی کی بنیاد پر قائم کئے گئے ہین تو کوئی مذہب ایسا نہین ملے گا جسکی

بنیاد خاص اصول پر نہ رکھی گئی ہو۔

ممکن ہے کہ کوئی فلسفی یہ دعویٰ کرے کہ "فلسفیانہ مسلمات" یا "علوم متعارفہ" جو بغیر دلیل کے تسلیم کئے جاتے ہیں ایسے ہیں کہ انسانی عقل خود بخود اُنکو ماننے کے لئے مجبور رہے، اور کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔ مگر میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی ذہن نے ان قوانین کو وضع کیا ہے، لیکن خود یہ قوانین انسانی ذہن کا خاصہ نہیں ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ کبھی کبھی ذہن پر ایسی حالت گذر جاتی ہے کہ وہ ان اصول کو نظر انداز کر جاتا ہے اور اُنکے برعکس خیال کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اقلیدس کے علوم متعارفہ میں سے پہلے قانون کو لیتا ہوں، یعنی یہ اصول کہ اگر دو چیزوں میں سے ہر ایک کسی تیسری چیز کے برابر ہو تو وہ دونوں چیزیں بھی آپس میں برابر ہونگی۔ بظاہر یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو تسلیم کرنے کے لئے انسانی ذہن ہر وقت اور ہر حالت میں مجبور رہے۔ لیکن اگر کسی سے یہ سوال کیا جائے کہ سیر بھر لوہا بھاری ہوتا ہے یا سیر بھر روئی تو فوراً جواب دینے میں اُسے تامل ہوگا، اور سو دو سو آدمیوں میں سے دو ایک ایسے بھی مل جائیں گے جو بے تکلف لوہے کو

بھاری کہدینگے، حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ دونون چیزین ایک ہی سیر کے برابر ہین -

ان علوم متعارفہ سے گزر کر جس وقت ہم حقائق موجودات کی طرف رجوع کرتے ہین تو وہان بھی ایسے اشیا کو پاتے ہین جن کا وجود تو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اُن کی تعریف سے فلسفی عاجز ہے. مثلاً زمان، مکان، مادہ، قوت وغیرہ- ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان چیزون کا علم ہم کو قدرتاً ودیعت کیا گیا ہے، اور یہ چیزین کسی تعریف کی محتاج نہین ہین، تو ایک مذہبی کہہ سکتا ہے کہ خدا اور روح وغیرہ ایسی چیزین ہین جن کا علم ہم کو قدرتاً ودیعت ہوا ہے اور کسی تعریف کی محتاج نہین ہین- اس فطری یقین کی بحث چونکہ کسی حد تک تفصیل چاہتی ہے اس لئے اُسے دوسری جگہ بیان کرونگا-

خلاصہ مقصد اس تمام تمہید سے یہ ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی جنگ دراصل کسی حقیقی اختلاف کی وجہ سے نہین ہے بلکہ اعتباری ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس ناگوار مباحثہ کا خاتمہ کر دیا جاے جس نے ایک طرف سے تو فلسفہ کو کفر و الحاد قرار دے کر کثیر جماعت انسانی کو

عملی اور ذہنی ترقیون سے روک دیا ہے، اور صداقت کے ساتھ آزادانہ اظہار خیال پر قیود عائد کر دیے ہین اور دوسری طرف بانیان مذہب اور مصلحان طریقت سے بدظن کر کے ارواح کو مکدر اور قلوب کو تاریک کر دیا ہے۔ ؎

حرم جویان درے را می پرستند　　فقیہان دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاران دیگرے را می پرستند

(٢)

مسئلہ ارتقاء

عام طور پر مسئلہ ارتقا اس یقین کا نام سمجھا جاتا ہے کہ انسان بندر سے
پیدا ہوا ہے، کسی مولوی کے سامنے اگر مسئلہ ارتقاء کا ذکر کیا جائے تو
سّو میں ننانوے مرتبہ یہی سُننے میں آئیگا کہ مسئلہ ارتقا کا ماننے والا خدا کی
خدائی سے منکر ہے۔ یہ حالت صرف مشرقی علماے مذہب ہی کی نہیں ہے
بلکہ یورپ کے مذہبی طبقہ کا بیشتر حصہ اب تک اسی قسم کے واہمہ میں مبتلا
ہے۔چند روز ہوئے مجھے ایک پادری سے ریل پر ملنے کا اتفاق ہوا،
جن کا تعلق ملک "سوئڈن" کی تبلیغی جماعت سے ہے۔ پادری صاحب
چلتی گاڑی میں بھی اپنے فرض سے غافل نہیں تھے اور اپنے ہمدرجہ مسافروں
کو پیغام عیسائیت پہونچا رہے تھے۔گو انکے خیالات میرے نزدیک اکثر
غلط تھے لیکن جس جوش کے ساتھ وہ اُن خیالات کا اظہار کر رہے تھے

وہ سچائی سے خالی نہین تھا، اور خاص لطف رکھتا تھا۔ بالآخر وہ میری طرف مخاطب ہوئے۔ دوران گفتگو مین مسئلۂ ارتقا کا ذکر آیا تو اُنھون نے نہایت حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا، اُنھین سخت تعجب اس بات پر تھا کہ کوئی شخص جو خدا پر اعتقاد رکھتا ہے، اور اسی کے ساتھ قرآن کو بھی مانتا ہے کیونکر مسئلۂ ارتقا کو تسلیم کرسکتا ہے، اور "بائبل" سے تو صاف ثابت ہے کہ سات ہزار سال کے قریب ہوئے کہ حضرت آدمؑ پیدا کرکے اس دنیا مین بھیجے گئے "ڈارون" جو اس مسئلہ کا معلم اول کہا جاتا ہے اُنکے نزدیک مُلحد تھا وغیرہ وغیرہ۔ مین نے جس وقت یہ کہا کہ طبقات الارض کی تحقیقات سے اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ انسان کا وجود کم سے کم پچاس ہزار سال اس زمین پر ہے تو پادری صاحب کو میری طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی ہرچند مین نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جس طرح ہم اسباب کا یقین رکھتے ہین کہ ایک بیج چند برسون مین طرح طرح کے تغیرات سے گذر کر ایک تناور درخت ہوجاتا ہے اور اس یقین کے باوجود خدا کی قدرت مین کوئی فرق نہین آتا اُسی طرح مسئلۂ ارتقا کا یقین بھی اُسکی خدائی پر حرف نہین لاسکتا مگر وہ بائبل سے مجبور تھے۔ الغرض اسی کے ساتھ انھین میرے اسلام مین

بھی شبہہ تھا۔

مسلمان علمار کی حالت بمقابلہ پادری صاحبان کے بہت بہتر ہے جسکی خاص وجہ یہ ہے کہ ایک زمانے مین وہ فلسفہ کے ساتھ زور آزمائی کرچکے ہین اور ایک حد تک اپنے مذہب کی اندرونی قوت پر اعتماد رکھتے ہین لیکن اسی کے ساتھ مشرقی ممالک مین مذہب کی طرف سے جو روک ٹوک فلسفیانہ تحقیق و مباحث کے راستہ مین اسوقت عملی طور پر حائل ہے یورپ مین اسکا نمونہ بالکل مفقود ہے۔ پادری صاحب اپنے دل مین جو کچھ بھی عقیدہ رکھتے ہون، اور فلسفہ کو جس حد تک بھی الحاد کا مرادف سمجھتے ہون حکومت اور رعایا کے عام رویہ پر اس بارہ مین اُنکا کوئی اثر نہین۔ ہم کو اپنے نقطۂ نظر مین جس تبدیلی کی سخت ضرورت ہے اُسکا ذکر دوسری جگہ مفصل آئیگا اسوقت اصول ارتقار اور مذہب کے ساتھ جو گہرا تعلق اس مسئلہ کا ہے صرف ان دو امور سے بحث کرنا چاہتا ہون۔

اصول ارتقار کو ماننے کے لئے یہ بات ضروری نہین ہے کہ انسان کا سلسلۂ نسب خواہ مخواہ بندرون سے ملایا جائے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ایک مرتبہ اصول ارتقار کو سمجھ لینے کے بعد ہم انسان یا کسی نوع حیوانی

کے یکایک دنیا مین آموجود ہونے کے نظریہ پر بمشکل یقین رکھ سکتے ہین -
پس لازمی طور پر حضرت آدمؑ کی شخصیت اور اُنکے متعلق جس قدر واقعات ایک تاریخی حیثیت سے سابق مفسرین نے پیش کئے ہین مشتبہ ہوجاتے ہین اور ہمارے لئے لازم ہوجاتا ہے کہ تخلیق آدم کے متعلق جو روایات کتب آسمانی مین مذکور ہین یا تو اُن سے صاف طور پر انکار کردین یا اُنکی تفسیر کسی اور طریقہ پر کرین اور یہی موقع ہے جہان ایک مذہبی کو بھڑک پیدا ہوتی ہے مگر مین کہتا ہون کہ پہلے ہم اصول ارتقا پر غور کرین اور اس کو سمجھین اور اگر واقعی ہم کو یہ اصول بمقابلہ اُن حکایات کے جواب تک ہم سُنتے رہے ہین قرین عقل معلوم ہو تو کوئی وجہ نہین کہ ہم محض سوسائٹی کے دباؤ یا فرضی کفر کے فتوے کے خوف سے حق پر پردہ ڈالکر باطل کا اقرار کرین اس لئے کہ سچائی ہی عین مذہب ہے، اور کوئی مذہب دنیا مین حقانیت سے بالاتر نہین ہے -

مین ایک قدم آگے بڑھنے کے لئے تیار ہون، اور میرا دعوی ہے کہ اصول ارتقا ہی تمام مذاہب کی بنیاد ہے - ظہور اسلام جسکو تکمیل نعمت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی قانون فطرت کا کرشمہ ہے جسکو ہم ارتقا کہتے

ہین، اور اسلام کا علمی فلسفہ یعنی تصوف تمامتر اسی اصول ارتقا پر مبنی ہے ممکن ہے کہ میرا یہ دعویٰ اس عقیدتمندانہ تعصب کی وجہ سے سمجھا جائے جو بچپن سے اسلامی تربیت حاصل کرنے سے ہو سکتا ہے، مگر مین اس خیال کی تردید کی چندان ضرورت نہین سمجھتا، بلکہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ ارتقا کو واضح کر دینے کے بعد مختلف مذہبی تعلیمات کو ترتیب وار رکھ کر ہم مطالعہ کرین کہ کس طرح مختلف مذہب وقتاً فوقتاً بہ تقاضائے فطرت ظہور مین آئے، حتےٰ کہ بفحوائے کلام اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا اس سلسلہ کی آخر کڑی اسلام ہے۔ اگر مین اس کوشش مین کامیاب ثابت ہوا تو تعصب کا گمان خود بخود رفع ہو جائے گا۔

پہلے اصول ارتقا کو سمجھنا چاہیے۔ اس عالم مین ہمارا علم ہمارے مشاہدات سے محدود ہے، یعنی جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے ہم جو کچھ جانتے ہین یا سمجھتے ہین اُسکا نقشہ یا تو حواس خمسہ ظاہری کے ذریعہ سے براہ راست ہمارے ذہن مین پیدا ہوتا ہے یا کبھی کبھی بالواسطہ انھین نقشون کو ترتیب دیکر ہم جدید نقشے اپنے ذہن مین تیار کر لیتے ہین۔ گویا اس طور پر ہم اپنے علم کے حصول مین نہ

صرف اپنے تجربات کے محتاج ہین بلکہ ایک حد تک اُن سے مجبور بھی ہین - یعنی اُن سے گریز نہین کر سکتے - مگر روزمرّہ کے تجربات اجسام مادی کے تغیرات تک محدود ہین - جو کچھ ہم محسوس کرتے ہین وہ صرف اُن صفات کی تبدیلی ہے جن سے اجسام متصف ہین یا جن کو عوارض کہتے ہین - لکڑی جلکر دھوان اور راکھ ہوجاتی ہے - دُھوان ہوا مین مل کر درختون کی غذا بن جاتا ہے گویا پھر لکڑی کی صورت مین تبدیل ہوجاتا ہے - راکھ مٹی مین ملکر کبھی نباتات کو قوت پہونچاتی ہے، کبھی کوئی جزو پانی مین گھل کر نمک یا پتھر ہوجاتا ہے - اسی طرح برف گھل کر پانی ہوجاتی ہے - پانی سے ابخرات بنتے ہین، ابخرات کبھی زیادہ منجمد ہوجاتے ہین تو پھر برف بنکر اولے کی صورت مین گرتے ہین کبھی صرف پانی ہی بن کے برستے ہین - پانی کبھی نباتات یا حیوانات کا جزو بدن ہوجاتا ہے، کبھی کوئی اور صورت اختیار کرلیتا ہے غرضکہ ہمارے سامنے جو تماشا ہوتا رہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک صورت مٹتی ہے اور دوسری ظہور مین آتی ہے -

اب اگر ہم ان تغیرات کے لئے کوئی کلیہ قائم کرنا چاہین تو اُس کی ابتدا یون کر سکتے ہین کہ تمام تغیرات دو قسم کے ہین، ایک وہ ہے جو دُوری کے

یعنی ایک صورت مختلف اشکال وصور مین تبدیل ہونے کے بعد پھر اپنی پہلی صورت پر لوٹ آتی ہے۔ اور دوسری قسم اُن تغیرات کی ہے جن مین چیزین بظاہر اپنی پہلی حالت پر واپس نہین آتین۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام تغیرات ایک نہ ایک معنی کر کے دوری ہین، البتہ بعض جلد اپنا دور پورا کر لیتے ہین اور بعض بدیر پورا کرتے ہین۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے چکرون سے ملکر بڑا دور بنتا ہے پھر اُس سے بھی بڑا دور معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ تمام عالم کے تغیرات مل کر کسی سب سے بڑے دور کو پورا کر رہے ہین، یا یون سمجھئے کہ جہان سے ابتدا ہوئی ہے وہین اس عالم کی انتہا بھی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ کہا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش   باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

لیکن ہم کو عالم کی ابتدا اور انتہا کا کوئی تجربہ نہین حاصل ہے اور نہ ہم اپنے ذہن مین کسی ایسے وقت کا تصور کر سکتے ہین جس سے پہلے یا جس کے بعد کچھ نہو، پھر بھی ابتدا اور انتہا ماننے کے لئے ہم مجبور ہین۔ گویا ہمارا ذہن اس معاملہ مین دونون حالتون کی نفی کرتا رہتا ہے۔ یعنی جو وقت ہم کسی حالت کو

ابتدا یا انتہا قرار دیتے ہین تو اُس سے پہلے اور اُسکے بعد کی حالتون کا تصور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جس وقت ہم اس سلسلہ کو بغیر ابتدا اور بغیر انتہا کے یعنی لا متناہی قرار دیتے ہین تو ذہن لا متناہی کے ادراک سے انکار کرکے اس سلسلہ کو ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے اس نفی و اثبات کے جھگڑے سے نکل کر ہم صرف اُن حالات پر غور کرین جو ہمارے تجربہ مین آچکے ہین اور جن پر ہمارا علم کسی حد تک حاوی ہے۔

تغیرات عالم پر نظر ڈالنے سے حسب ذیل اصول ہمکو نظر آتے ہین:-

(۱) ہر چیز اپنی موجودہ حالت پر رہنا چاہتی ہے، گویا ہر شی مین اندرونی طور پر قوت مدافعت موجود ہے۔

(۲) تغیرات ہمیشہ بیرونی اثرات کی وجہ سے ہوتے ہین۔

(۳) نئی صورت جو پیدا ہوتی ہے وہ اُس مقابلہ کا نتیجہ ہے جو خارجی اثر اور اندرونی قوت مدافعت مین باہم ہوتا ہے۔

ان تینون اصولون کے لحاظ سے ہر چیز جب نئی صورت اختیار کریگی تو ایسی ہوگی کہ بیرونی اثرات یعنی ماحول کی مدافعت کے لئے بمقابلہ

پہلے سے زیادہ پائدار ہو۔ یہ حالت جمادات، نباتات، حیوانات سب کی ہے اور یہی اصول ارتقا ہے۔

تمام عالم سے قطع نظر کرکے اسوقت ہم صرف اُن حوادث پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہین جو ہمارے کرۂ زمین پر گزرے ہین، اور دیکھنا چاہتے ہین کہ کس طرح ہر زمانے اور ہر حالت مین اصول ارتقا اپنا کام کرتا رہا ہے۔ محققین کی راے ہے کہ کسی زمانے مین جسکا شمار کروڑون سال کی تعداد مین کیا جاسکتا ہے زمین ایک آتشین گولا تھی، اور اغلب ہے کہ اس سے پہلے کرۂ آفتاب کا ایک جزو تھی جس سے جُدا ہو کر اُس نے ایک علحدہ کرہ کی صورت اختیار کی تھی اور شدید حرارت وراشت مین پائی تھی حیوانات ونباتات تو الگ رہے اجمادات کی بھی یہ صورت نہ تھی جو اب ہے۔ تمام مادّی اجزا، ایک شعلہ جوالہ کے مانند تھے گویا نہایت لطیف ہوائی جسم رکھتے تھے، اور اس لطیف مادہ کی بھی صرف چند قسمین تھین۔ رفتہ رفتہ حرارت کے زوال کے ساتھ بعض اجزا نے رقیق صورت اختیار کی اور بعض جم بھی دُخان اور ابخرات کی صورت مین اُسکے گرد نہایت گرم ہوائی غلاف بنائے ہوئے تھے۔ یہ حالت کم سے کم کروڑون سال مین پیدا ہوئی۔

زیادہ عرصہ تک ٹھنڈھی ہونے کے بعد زمین پر انجماد شروع ہوا جس طرح دودھ مین کھولنے کے بعد بالائی پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ اندرونی حصہ مین حرارت اور سیلان اب بھی زیادہ تھا اس لئے اُس مین ہر وقت ایک ہیجان اُٹھتا رہتا تھا جس سے بالائی طبقہ ہر وقت متزلزل رہتا اور جلد جلد صورت بدلتا رہتا تھا۔ کبھی کوئی حصہ زیادہ اُبھر جاتا تو کوئی حصہ زیادہ دب جاتا۔ کبھی کہین کہین سے کوئی حصہ پھٹ جاتا اور بڑے بڑے غار پیدا ہو جاتے جس مین سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے رہتے۔ یہان تک کہ رفتہ رفتہ بلندی اور پستی نے زیادہ پائدار صورت اختیار کی اور جا بجا بہت اونچے پہاڑ اور انھین کے مقابلہ مین بڑی بڑی گھاٹیان اور غار پیدا ہو گئے۔ اگرچہ زمین کا بالائی حصہ سخت ہو کر اب مثل پتھر کے تھا، پھر بھی حرارت کم ہوئے پانی سے زیادہ تھی اور اس وجہ سے پانی کے اجزا اب بھی کثیف ابر کی صورت مین ہوائی غلاف کے ساتھ زمین کو محیط تھے، لیکن کہین ایک قطرہ پانی کا نہین تھا۔

جب زمین اور زیادہ ٹھنڈھی ہوئی تو بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن جلتے توے پر جو پانی گرتا تھا پھر بھاپ بنکر اُڑ جاتا تھا۔ لاکھون سال بارش

ہونے کے باوجود دریا اور سمندر کا کہین وجود نہ تھا۔ اس حالت سے
گزر کر زمین کی وہ صورت پیدا ہوئی جو ادنیٰ تغیرات کے ساتھ اب ہمارے
سامنے موجود ہے۔ یعنی پانی نے زمین پر قیام اختیار کیا اور بعض بڑی
بڑی گھاٹیون اور غارون کو بھر دیا جو سمندر ہو گئے۔ متواتر بارش اور
ہوا کے اثر سے پہاڑون کے بعض جزو گھس پس کر پانی کے ساتھ نشیب
مین آکر تہ نشین ہوئے اور بعض غارون کے پُر ہو جانے سے مسطح زمین
کی صورت پیدا ہو گئی۔

زمین کی یہ آخری صورت بھی اگرچہ کروڑہا سال سے قائم ہے لیکن
اس دوران مین بھی بڑی بڑی تبدیلیان پیدا ہوئی ہین جو ابتدائی حالت
کے مقابلہ مین پھر بھی ادنیٰ خیال کی جاسکتی ہین۔ بعض وہ مقامات جو
پہلے سمندر تھے اب خشک ہو کر براعظمون مین تبدیل ہو گئے۔ جیسے افریقہ
کا صحراے اعظم یا ہندوستان کا شمالی حصہ جس مین سے ہو کر دریاے گنگا
اور دریاے انڈس اب بہتے ہین۔ اسی طرح بعض حصے جو اب سمندر ہین
پہلے خشک تھے مثلاً بحر ہند کا وہ حصہ جو برہما اور آسٹریلیا کے درمیان ہے
اور جس مین زمانۂ گزشتہ کے ایک براعظم کی یادگار جزائر ملایا کی صورت مین موجود ہے

یا یورپ مین وہ آبنائے جو فرانس اور برطانیہ کے درمیان واقع ہے۔
غرضکہ ابتدا مین زمین کو جلد جلد اور عظیم الشان حوادث کا سامنا ہوتا تھا
رفتہ رفتہ سکون کی حالت پیدا ہوتی گئی اور حوادث کا اثر کم اور بہ دیر
ہونے لگا۔

اس طرح گویا جمادات نے سرد و گرم زمانہ کا مقابلہ کرکے روز بروز
اپنی ایک زیادہ دیرپا صورت اختیار کرنی شروع کی۔ نباتات اور حیوانات
کا دور اسکے بہت بعد شروع ہوا۔ لیکن تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قسم
کے درخت اور جانور پہلے اس دنیا مین پائے جاتے تھے اب وہ بالکل
مفقود ہین اور اُنکی جگہ دوسری قسم کے درختون اور جانورون نے لے لی
ہے۔ مختلف زمانہ کے اجسام نامیہ یعنے نباتات اور حیوانات کو جب
ہم سلسلہ وار رکھ کر مقابلہ کرتے ہین تو چند باتین اُن مین پاتے ہین:-

اول یہ کہ ہر زمانے کی مخلوق اپنے سے پہلے زمانہ کی مخلوق سے ملتی
جُلتی ہے اور جو تبدیلیان اُنکی صورت و شکل مین ہوئی ہین وہ بہت آہستہ
آہستہ ہوئی ہین۔ دوسرے یہ کہ نئی صورتین ایسی پیدا ہوتی گئی ہین جو
حوادثِ زمانہ کا مقابلہ زیادہ قوت کے ساتھ کرسکتی تھین۔ تیسرے یہ کہ

زمین کے مختلف حصوں مین پھیل جانے کی وجہ سے بھی نباتات اور
حیوانات نے اپنی ضرورت کے مطابق چند نسلون مین اپنی صورت
اور شکل مین تبدیلیان پیدا کرلی ہین - اس طرح گویا تمام اجسام نامیہ جو
اس وقت دُنیا مین پائے جاتے ہین ایک ہی اصل کی شاخین ہین جو
لاکھون صدیون کے تغیرات کے بعد اب اپنی موجودہ صورت پر
بظاہر قائم ہین - لیکن دراصل قانون قدرت یعنے اصول ارتقاء اب بھی اُنکے
اندر کام کر رہا ہے اور ماحول کی مناسبت سے اب بھی اُن مین وہی خفیف
تبدیلیان برابر جاری ہین -

بنی نوع انسان کے وجود کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ کم وبیش
ایک لاکھ سال سے اس دُنیا مین موجود ہے - لیکن دس ہزار پہلے کے
جن انسانونکی لاشین دستیاب ہوئی ہین اُنکی ساخت جسمانی اُنکی ہڈیان
اور خاصکر اُنکی کھوپڑی موجودہ زمانے کے انسانون سے کسی قدر مختلف ہین
اور دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو اُنکے جسم بمقابلہ ہمارے زیادہ مضبوط
تھے مگر اُنکی دماغی حالت اور قوائے ذہنی کمزور تھے - یہ حالت دوسرے
حیوانات کی بھی معلوم ہوتی ہے - زمانہ سابق کے بعض جانور نہایت عظیم الجثہ

اورجسم کی بناوٹ کے لحاظ سے عجیب الخلقت تھے مگر دماغ بہت چھوٹا اور کمزور رکھتے تھے، اسی وجہ سے وہ اپنی نوع کو قائم نہ رکھ سکے۔ بالآخر قدرت نے انکو رفتہ رفتہ دوسرے انواع مین تبدیل کر دیا جن کے قوائے ذہنی کو بمقابلہ اعضائے جسمانی کے زیادہ ترقی ہوتی گئی اور وہ حوادث عالم کا زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل ہوتے گئے۔

پچاس ہزار یا ایک لاکھ سال قبل کے جو انسان تھے اُن مین اور موجودہ زمانہ کے بعض بندرون کی قسمون مین بہ لحاظ جسمانی اور دماغی ساخت کے بہت تھوڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر یہ قیاس کیا گیا ہے اور یہ قیاس قرین عقل بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۂ ارتقا مین سے گزرتے ہوئے انسانیت سے پہلے ایک دور بہیمیت کا بھی حضرت انسان پر گزرا ہے، یا بہ الفاظ دیگر ایک لاکھ سال یا اُس سے بھی پہلے کے بندرون مین جو تبدیلیان بہ تقاضائے ارتقا ہوئی ہین اُنکا مجموعی نتیجہ انسان کا وجود ہے۔

یہین پر آکر ایک مذہبی آدمی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار سوال کر بیٹھتا ہے کہ کیون صاحب کیا حضرت آدمؑ کو خدا نے

نہین پیدا کیا؟ میرے پاس اسکا صرف ایک جواب ہے۔ یعنی اس تمام سلسلۂ تغیرات مین مجھے تو سوائے ایک واحد، مؤثر کل حکیم اور دانا ہستی کے اور کچھ نظر نہین آیا۔ پھر اگر حضرت آدمؑ کو خدا نے نہین پیدا کیا تو کیا مین نے یا آپ نے پیدا کیا؟ لیکن مین اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہون کہ اگر حضرت آدمؑ یا بہ الفاظ دیگر حضرت انسان کی خلقت بجائے اتفاقی کے ارتقائی تسلیم کیجائے تو خدا کی خدائی پر کیا حرف آتا ہے؟ انسان کی پیدائش کا قصہ جیسا کہ کتب مذہبی مین مذکور ہے مین عمداً اسوقت اُسکی تفصیلی بحث مین نہین پڑنا چاہتا، بلکہ اصول ارتقا کی وسعت اور اس قانون کی ہمہ گیری کے متعلق چند الفاظ لکھکر ختم کرنا چاہتا ہون۔ البتہ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ انسان نے کب اور کس وقت اپنا طریق میمونیت چھوڑکر جامۂ انسانیت اختیار کیا اور نیابت الٰہی کا استحقاق پیدا کیا تو مین کہونگا کہ جس وقت سے اُس نے اپنے گرد و پیش کی چیزونکے نام رکھنے شروع کئے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا۔ یعنی آدمؑ کو سب چیزونکے نام بتائے۔ اور اسی نطق کے ذریعہ سے جب وہ اُن رموز قدرت کو فاش کرنے پر آمادہ ہوا

جنکا مشاہدہ مختلف صُوَر و اشکال مین سے گزرتے ہوئے اُسنے کیا تھا
تو بہشت کی غیر ذمہ دارانہ اور بے خطر زندگی اُس سے چھین لی گئی۔

اب اگر ہم کارخانۂ قدرت پر ایک نظر وسیع ڈالین تو ہمکو معلوم ہو گا کہ نہ صرف اس خاکدانِ عنصری مین جسکو زمین کہتے ہین، بلکہ عالم خلق کے ہر ہر جزو پر چھوٹے چھوٹے ذرون سے لیکر عظیم الشان ثوابت تک جن کی روشنی ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ چلنے کے باوجود ہم تک برسون بلکہ صدیون اور کبھی ہزارون برس مین پہونچتی ہے، اصول ارتقا کی حکمرانی ہے، اور ہر آن اور ہر لحظہ کے تغیرات اسی ایک قانون کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے رہتے ہین۔ بنی نوع انسان کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہین تو اُسکی زندگی کے ہر شعبہ مین خواہ اُسکا تعلق سیاسیات، تمدن، معاشرت، اخلاق، مذہب، غرضکہ کسی شی سے ایک نہ ایک تغیر ہر لحظہ رونما ہوتا رہتا ہے، اور ہر تغیر کا میلان یہ ہوتا ہے کہ پچھلی صورت کو چھوڑکر نئی اور بہتر اور زیادہ پائدار حالت اختیار کیجائے حتّٰی کہ انسانی ذہن اور انسانی تخیلات مین بھی اصول ارتقا کے مطابق ترقی جاری ہے۔

انسان کا ایک فوق الانسان نوع مین تبدیل ہوجانا صرف دس بیس ہزار سال کا

عرصہ چاہتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے بڑھکر کیا ہونیوالا ہے ؎
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہین محو حیرت ہون کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی
حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے اس عمل ارتقا کو بیان کرتے ہوئے
انسان کی انتہائی ترقی کیطرف نہایت دلکش اشارہ کیا ہے۔

از جمادی مُردم و نامی شدم وز نما مُردم بحیوان بر زدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم پس چہ ترسم کہ زمردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر تا برآرم با ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک قربان شوم آنچہ اندر وہم نآید آن شوم
پس عدم گردم عدم چون ارغنون گویدم اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ یہ ہے خلاصہ تاریخ عالم اور اسی مین مبدأ و معاد
اور حقیقت ارتقا سب موجود ہے۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۝

(۳)

ارتقائے شعور

یا

طلبِ معرفت

مین نے کسی جگہ طلبِ معرفت کو "اولین فطرت" لکھا ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ اسکا تعلق مسئلۂ ارتقا کے ساتھ کیا ہے؟ اس مسئلہ کی تحقیق کرتے وقت سمجھا گیا ہے کہ ہر شے اپنی صورت پر قائم رہنا چاہتی ہے اور اگر حوادثِ عالم اسے تبدیل ہیئت پر مجبور کرتے ہین تو وہ زیادہ پائدار صورت اختیار کرنے پر مائل ہوتی ہے، گویا دراصل اصول ارتقا فنا اور بقا کے تنازع سے وابستہ ہے، یعنی کائنات کے ہر ذرہ کو بقا کی خواہش ہے لیکن حوادثِ عالم اُسے فنا کرنا چاہتے ہین، پس وہ ایک افضل اور اعلیٰ مقام کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہان بھی اُسے وہی مقابلہ پیش آتا ہے پھر وہ اور آگے بڑھتا ہے۔ اور اسی طرح سلسلہ بسلسلہ ترقی کرتا رہتا ہے

اسی طلب کمال کا نام حرکت ارتقائی ہے اور ازل سے ابد تک اسکا حکم جاری ہے، یہی منشاے تخلیقِ عالم ہے۔ یہی مشیت اولی ہے اور یہی امر رب یا روح کلی ہے۔

اس جگہ پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کیا جمادات، نباتات اور علاوہ انسان کے دوسرے حیوانات مین بھی روح پائی جاتی ہے یا بہ الفاظ دیگر کیا اُن مین بھی کسی قسم کا شعور و ادراک موجود ہے؟ کیا کارخانۂ عالم سے وہ بھی اسی طرح سبق حاصل کرتے ہین جس طرح انسان؟ اور کیا اُنکی طلب معرفت کی بھی وہی نوعیت ہے جس کی علامتین ہم مین پائی جاتی ہین؟ ان سوالات کا جواب مذہب کی جانب سے بہت واضح طور پر دیا گیا ہے۔ یعنی یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ یعنی "زمین اور آسمان مین جو کچھ ہے سب خدا کی تسبیح مین مشغول ہین"۔ اور تسبیح کا مفہوم عبادت یعنی معرفت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس عمومیت مین ملائکہ انسان، حیوان، نبات و جماد سبھی شریک ہین اور یکسان اطلاق سب پر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ غیر ذی روح کے لئے یہ لفظ مجازاً استعمال کیا گیا ہے اور ذی شعور ہستیون کے لئے حقیقی معنی مراد ہین۔ لیکن میرا مطالعہ

اسکے خلاف ہی جس کو تا امکان بیان کرنے کی کوشش کرتا ہون -

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ جو مرتبہ شعور ہم کو حاصل ہے کیا وہ یکایک ہم مین پیدا ہو گیا ہے یا درجہ بدرجہ ترقی کرکے اس مرتبہ پر پہونچا ہے؟ - اول تو اصول ارتقا اس ادراک ذہنی یا قوت شاعرہ کے یکایک پیدا ہونے کے خلاف ہے - دوسرے گزشتہ اقوام کی تاریخ اور حالات پر غور کرنے اور موجودہ زمانے مین جن وحشی اقوام کے قواے ذہنی ہم سے ادنی درجے پر ہین اُن کی دماغی ساخت کا مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ادراک ذہنی کے مراتب ہین - تیسرے اگر کسی ایک انسان کے حالات کا ہم مطالعہ کرین تو بھی معلوم کر سکتے ہین کہ بچپن سے لیکر جوانی اور بڑھاپے تک کیا کیا تغیرات قوت شاعرہ مین ہوئے ہین اور کس طرح قواے دماغی رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہین - پس اگر مدارج شعور کو ہم ترتیب دینا چاہین تو انسان سے گزر کر اُسکا سلسلہ جانورون اور پھر درختون اور گھاس کے پودون یہانتک کہ معدنیات اور خاک کے ذرون تک قدرتًا اس طرح پھیلا ہوا نظر آئیگا کہ کہین ایک کڑی اور اُس سے ملی ہوئی دوسری کڑی مین کوئی فرق نہ معلوم ہو گا - البتہ اگر چند درجے درمیان مین چھوڑ کر مقابلہ

کیا جائے تو ضرور فرق معلوم ہوگا لیکن یہ فرق مراتب ہوگا نہ کہ امتیاز حقیقی شعور انسانی، ادراک، یا قوت تمیزی جو کچھ بھی نام ہم اس قوت کو دین جو جزئیات سے کلیات کا استنباط بہ طریق استقرا اور پھر کلیات سے جزئیات کا استخراج بطریق قیاس منطقی کرتی ہے، جس وقت ہم اس قوت کی حقیقت پر نگاہ ڈالتے ہین تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قوانین قدرت کا جو تجربہ اور مشاہدہ ہم کو ہر آن ہوتا ہے اُنکا اعادہ جب بکثرت ہوتا ہے تو وہ تجربے راسخ ہو کر ہمارے نفس کا جزو ہو جاتے ہین اور اسباب و نتایج کے تعلق کا یقین ہماری فطرت مین داخل ہو جاتا ہے گویا عادت طبیعت بنجاتی ہے اور اسی طبیعت کی مناسبت سے ہم اپنی حالت کو اس طرح قائم کرنا چاہتے ہین کہ اس مین پائداری ہو اور پھر یہی طبیعت یا فطرت ہم سے آئندہ نسل کو وراثت مین ملتی ہے جو اپنے تجربون اور مشاہدون کا اُسپر اضافہ کرکے اور اپنی طبیعت کو ماحول کے مطابق کسی قدر بدل کر ترقی کے راستہ پر دوسرا قدم رکھتی ہے۔ اسی ملکۂ فطری کو جو کثرت مشاہدہ سے ہم مین پیدا ہو گیا ہے اور جو اسباب و نتایج کے تعلق کا یقین رکھتا ہے اور ہر حال مین اُسکا لحاظ کرتا ہے "شعور" کہتے ہین۔

اس نقطۂ نظر سے ہماری موجودہ قوتِ شاعرہ اُن تجربون سے پیدا ہوئی ہے جو پہلے جمادات کو حاصل ہوئے تھے اور اُن سے تفویض ہو کر نباتات، پھر حیوانات اور اسی طرح درجہ بدرجہ ہم تک مع اُن تمام اضافون کے پہونچے ہین جو ہر دور مین ہوتے رہے ہین - کیا اتنا معلوم کرنے کے بعد کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ درختون یا پتھرون مین بالکل شعور نہین ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ چیزین بالکل کسی اصول یا قانون کی پابند نہ ہوتین اور نہ اُن مین کسی قسم کی تنظیم پائی جاتی -

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ شعور خاصہ ہے جسم کے ایک مخصوص حصہ کا جس کو "دماغ" کہتے ہین - پھر نباتات یا جمادات جن مین دماغ بالکل موجود نہین کیونکر ذی شعور ہو سکتے ہین تو اُسکے دو جواب ہین - اول یہ کہ زمانۂ حال کے محققین علم حیات نے جن مین کلکتہ کے ڈاکٹر جگدیش چندر بوس خاص طور پر قابل ذکر ہین نہایت نازک تجربون اور مضبوط دلیلون سے ثابت کیا ہے کہ درختون مین بھی ایک قسم کی روح پائی جاتی ہے اور ادنیٰ درجہ کا شعور اُن مین بھی موجود ہے - دوسرے دماغ انسانی کی کیفیت ارتقائی کی اگر جانچ کیجائے تو معلوم ہوگا کہ

انسان ہین اُسکا حجم اور وزن بلحاظ بقیہ جسم کے بہت زیادہ ہے اور اُسکی ساخت نہایت پیچ در پیچ اور شکن در شکن واقع ہے - جانورون مین یہ حجم اور پیچ کم ہوتا گیا ہے حتّٰی کہ چھوٹی چڑیون اور مچھلیون وغیرہ مین نہایت مختصر اور سپاٹ ہے - ادنی درجہ کے حشرات الارض مثلاً کیچوے مین صرف رگون یا پٹھون کی ایک گرہ سی سر کی جانب پائی جاتی ہے - اس لئے اگر دماغ کی کوئی جامع تعریف کیجائے تو اُسکی حقیقت یہ قرار پاتی ہے کہ دماغ نام ہے اُس مرکز کا جس کے گرد ہمارے جسم کی تعمیر ہوئی ہے اور جس سے تمام عروق اور اعصاب متفرع ہوئے ہین اور جو جسم پر حکمرانی کرتا ہے - اب اگر نباتات مین ہم دیکھتے ہین تو اُن مین بھی اس قسم کا مرکز ملتا ہے اور کبھی کبھی بجاے مرکز واحد کے ہر ہر پتے مین عروق و اعصاب کے مرکزون کا پتہ چلتا ہے - پس ایک نہ ایک مرتبہ پر اُنکے پاس بھی دماغ موجود ہے -

جمادات کے متعلق کوئی خاص بات ابتک پایۂ تحقیق کو نہین پہنچی ہے، لیکن زیادہ عرصہ نہین گزرے گا کہ سلسلۂ ارتقا کی اس آخری کڑی کا پتہ بھی چل جائیگا - بعض نمونے اب بھی قابل لحاظ سمجھے گئے ہین مثلاً

معدنیات کے وہ اقسام جو بلوری شکل رکھتے ہین جیسے نمک یا پھٹکری یا اکثر قسم کے قیمتی پتھر - یہ چیزین پانی یا کسی اور سیال چیز مین گھلنے کے بعد جب تہ نشین ہو کر جمنا شروع ہوتی ہین تو خاص خاص اقلیدسی شکلون مین اپنے کو منتظم کرتی ہین اور ان شکلون کی تعمیر ہمیشہ ایک مرکز سے شروع ہوتی ہے بسا اوقات مشاہدہ ہوا ہے کہ کسی مرکز کے نہ قائم ہونے کی وجہ سے ان اشکال بلوری کی ترتیب و تعمیر ملتوی رہی ہے ، حالانکہ تمام کیمیائی اور طبیعی اسباب موجود تھے - ایسی صورت مین کسی خارجی مدد سے مرکز پیدا کر دیا گیا تو فوراً انجماد شروع ہوگیا - مثلاً شورہ اگر پانی مین گھلا ہوا ہو تو آگ پر رکھنے سے جب پانی کی کافی مقدار اُڑ جائے گی تو شورہ بلوری قلمون کی شکل مین جمنا شروع ہوجائیگا - لیکن کبھی کبھی پانی کی کافی مقدار اُڑ جانے کے باوجود ایسا نہین ہوتا - اُسوقت کوئی چھوٹے سے چھوٹا تنکا یا کنکری یا سب سے بہتر ہوگا کہ شورہ ہی کا کوئی ٹکڑا اگر چھوڑ دیا جائے تو فوراً اُس کے گرد تعمیر شروع ہوجائیگی اور شورہ کی بڑی چھوٹی قلمین نمودار ہونے لگین گی -

اس بارے مین اجزائے دمقراطیسی کے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہی

دلچسپی سے خالی نہین ہے۔ کسی عنصر کے چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو دلیقر طیسیہ کہتے ہین۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ دراصل یہ ذرے بھی نہایت ہی چھوٹے چھوٹے برقی اجزا سے بنے ہوئے ہین اور ان برقیات کی تنظیم بھی ایک مرکز خاص کی محتاج ہے اور اس مرکزی جزو کی نوعیت بقیہ تمام برقی اجزا سے جداگانہ ہوتی ہے۔

بہرکیف خلاصہ مقصد صرف یہ ہے کہ انسانی دماغ جس کو اتنی اہمیت ہم نے دے رکھی تھی جس وقت اسکی تحقیق ہم نے شروع کی تو تحلیل ہوکر وہ کیا سے کیا ہوگیا۔ اب ہم دوبارہ اسکی تعمیر کرنا چاہتے ہین۔

حقیقت یہ ہے کہ قوت شاعرہ یا ادراک ذہنی دماغ سے نہین پیدا ہے بلکہ اس قوت نے خود اجسام کے اندر اپنا ایک مرکز بنانا شروع کیا جس کا نام دماغ پڑگیا۔ گویا دماغ سے ذہن نہین ہے۔ بلکہ ذہن سے دماغ ہے۔ اب دماغ کی تعمیر یون شروع کیجا سکتی ہے۔ شعور مادہ سے علیحدہ کوئی چیز نہین۔ بلکہ اسکا لازمی خاصہ یا اصطلاحی تفریق سے قطع نظر کیجئے تو مین کہونگا کہ شعور مادہ کی حقیقت مین داخل ہے جس کے بغیر اسکا پایا جانا ناممکن ہے۔ اور اگر ہم اجسام مادی کے علاوہ اور قسم کے اجسام مثلاً اجسام نوری وغیرہ کے قائل ہین

تو اس نظریہ کو وسعت دیکر یہ کہہ سکتے ہین کہ شعور وجود محض کو مستلزم ہے لیکن اس جگہ صرف اجسام مادی تک بحث کو محدود کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگر علمی اصطلاح کا استعمال بے موقع نہو تو کہا جا سکتا ہے کہ مادہ کا وہ خاصۂ لازمی جس کو علم طبعیات مین "انرشیا" (INERTIA) یعنی قوت انفعالی کہتے ہین اور جس پر "نیوٹن" کے قانون حرکت کا دارومدار ہے اور جس کی وجہ سے ذرات مادی حوادث عالم سے متاثر ہوتے ہین سب سے بڑا ثبوت شعور کا ہے۔ یا سیدھے سادے الفاظ مین ذرات مادی کا قوانین قدرت کی متابعت کرنا اُنکے شعور کی دلیل ہے۔

مادہ کو حوادث عالم یعنی بیرونی اثرات یا قوتون کا جب تجربہ ہوتا ہے تو وہ اُسکی اطاعت کرتا ہے۔ اور اُن قوانین قدرت کو معلوم کرنا چاہتا ہے جن کے ماتحت یہ قوتین کام کرتی ہین۔ کثرت مشاہدہ اور تجربہ سے اُسے ان قوانین کے ادراک یا عرفان کا ایک مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے ماحول کے مطابق اپنی تنظیم کرتا ہے۔ اپنے مشاہدات کو وہ اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے۔ اپنی ضرورتون کو پورا کرنے کے لئے اسکی قوت مدرکہ ایک مرکز مادی قائم کرتی ہے جو درجہ بدرجہ موالید ثلاثہ مین ترقی کرتا ہوا

حالات موجودہ کے لحاظ سے اپنی بہترین صورت مین انسانی دماغ بن کر
اسوقت موجود ہے۔

اکثر لوگون نے ذہن اور مادّہ کی تقسیم بطریق انحصار عقلی کے کی ہے
یعنی مادّہ اور ذہن کو دو متضاد حقیقتین قرار دیا ہے۔ لیکن دماغ کی تحلیل و
ترکیب کو معلوم کرنے اور قوت مدرکہ کی حقیقت کا مشاہدہ کرنے کے بعد
ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہین کہ جہان مادہ ہے وہان شعور بھی موجود ہے، یا
بہ الفاظ دیگر ذہن اور مادّہ لازم و ملزوم ہین۔ یا کیا عجب ہے کہ بجز ایک
ذی شعور ہستی کے کسی اور چیز کا وجود ہی نہو۔ لیکن اس حقیقت کو زیر بحث
لانے کا موقع نہین۔ بلکہ صرف شعور جزئی جیسا کہ اجزاے عالم مین وہ پایا
جاتا ہے موضوع بحث ہے۔

شعور یا ادراک کی اس وسعت اور کائنات کے ہر ذرّہ مین موجود ہونیکی
واقعیت کو معلوم کرنے کے بعد کیا ہم اس نتیجہ پر نہین پہونچتے کہ اس عالم
مین کوئی وجود خواہ بیجان مٹی کا ایک ریزہ ہی کیون نہو جسوقت اُس کو
حوادث عالم کا تجربہ ہوتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح "لَا اُحِبُّ
الْاٰفِلِیْنَ" کہکر اپنی زود فنا ہستی سے مُنھ موڑ لیتا ہے اور قوانینِ قدرت

کے مشاہدہ سے عرفان کا ایک مرتبہ حاصل کرکے اِنّی وَجَّہْتُ وَجْہِیَ
لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کہتا ہوا بقا کا عازم ہوتا ہے اور پہلے
سے بہتر اور دیرپا صورت اختیار کرتا ہوا ارتقا کے دوسرے زینہ پر قدم
رکھتا ہے۔ اس طرح کشش ارتقا اور طلبِ معرفت دونوں کی حقیقت
بالکل متحد نظر آتی ہے اور صاف سمجھ مین آجاتا ہے کہ طلب کمال و تلاش
حقیقت نہ صرف انسان بلکہ کل کائنات کی فطرت مین داخل ہے۔
پھر کوئی وجہ نہین کہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کی
تشریح مین مجاز و حقیقت کی تفریق کیجائے۔ یا زبانِ قال اور زبانِ حال
کے قیود عائد کیے جائین۔ اس لیئے کہ فطرت نے ایک ہی زبان سب کو
عطا کی ہے اور وہی حقیقی زبان ہے باقی انسان کی اختراع کردہ اصطلاح ہے
رہی یہ بات کہ اگر کوئی شخص الفاظ "سبحان اللہ وبحمدہ" یا اسکے
مثل دوسرے الفاظ کے بار بار اعادہ کو تسبیح قرار دے اور اسکے تلفظ
کے ساتھ سُننا چاہتا ہو تو مجھے معلوم ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور
یہ کوئی مشکل بات نہین بلکہ بعض فلسفیانہ مثالون سے اسکا امکان ثابت
بھی کیا جاسکتا ہے مگر اسکا یہ محل نہین ہے۔ البتہ طلب معرفت کے متعلق

ایک نکتہ لکھدینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو آگے آتا ہے۔

جس وقت منازل ارتقا اور انسان کی قابلیت کسب کمال پر ہم نظر ڈالتے ہین تو جیسا کہ بیشتر کہا گیا ہے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ یہ قابلیت درجہ بدرجہ ترقی کرتی آئی ہے اور موجودہ مخلوقات مین جو کرۂ ارض پر موجود ہین انسان مین سب سے زیادہ پائی جاتی ہے اور آئندہ اس مین ترقی کا یقین ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی طرح یہ ممکن ہے کہ جو مرتبہ عرفان بنی نوع انسان کو ہزارون سال مین حاصل ہوگا اسکو ہم کم سے کم انفرادی طور پر کسی حد تک اپنی زندگی کے کسی حصہ مین حاصل کرلین؟ اسکے جواب کے لئے ہم کو پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کیا کسی ہستی کے لئے یہ ممکن ہے کہ جمادات سے لیکر انسان تک جو ارتقا کے مراتب گزرے ہین اور جنکی مدت کرور سال تخمینہ کیجاتی ہے کسی قلیل عرصہ مین طے کرے؟ اگر گذشتہ مدارج کو کسی قلیل مدت مین طے کرلینا ممکن ہوگا تو آئندہ کے لئے بھی توقع کیجاسکتی ہے ورنہ نہین۔

اب اگر ہم انفرادی طور پر کسی انسان کی خلقت کی تحقیق کرین تو معلوم ہوگا کہ جمادات روزمرہ تحلیل ہوکر نباتات کی صورت مین منتقل

ہوتے رہتے ہین۔ نباتات جانورون کی غذا بنتی ہے۔ انسان نباتات اور حیوانات دونون کو ہضم کرتا ہے جس سے اُسکا خون بنتا ہے۔ خون سے نطفہ کی پرورش اور پیدائش ہوتی ہے۔ نطفہ جب مان کے رحم مین منتقل ہوتا ہے تو وہ ایک نہایت ادنیٰ قسم کا کیڑا ہوتا ہے۔ گویا حیوانیت کی پہلی منزل مین ہوتا ہے۔ مان کے پیٹ مین نو مہینے کے اندر اُسپر وہ تمام ارتقائی حالتین گزرتی ہین جو ظہور انسان سے پہلے غالباً لاکھون صدیون مین حیوانات پر گذری ہونگی۔

ابتدا مین جیسا کہا گیا ہے وہ ایک ادنیٰ ترین قسم کا کیڑا یا محض ایک زندہ بیج ہوتا ہے۔ پھر حشرات الارض مثلاً جونک یا کیچوے کے مثل صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر مچھلیون سے ملتا جلتا ہوا ہوتا ہے پھر مینڈک پھر چھپکلی کے مانند ہوجاتا ہے۔ غرضکہ اسی طرح تبدیل ہیئت کرتا ہوا وہ بندر کے مشابہ صورت اختیار کرتا ہے۔ بالآخر مکمل ہو کر ایک انسان کا بچہ بن کر مان کے پیٹ سے باہر قدم رکھتا ہے۔ اس تمام دوران مین اُسکے دماغ کی ساخت بھی اُسکے جسم کی مناسبت سے بدلتی رہتی ہے۔

پیدائش کے بعد اگر ایک کم سن بچے کے احساس اور خیالات

کی جانچ کیجائے تو معلوم ہو گا کہ اُسکا دماغ اُن تمام مدارج کو طے کر لیتا ہے جو زمانۂ قدیم کے وحشی اور زمانۂ حال کے مہذب کہلانے والے انسان کے درمیان واقع ہین یہانتک کہ وہ صاحب علم و حکمت محقق اور موجد بنجاتا ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ گذشتہ منازل ارتقاء کو ایک قلیل مدت مین طے کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔ اسکے بعد عقل کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم تحریک ارتقاء کو اپنے اندر زیادہ قوت دین تو یہ بات دشوار نہین ہے کہ زمانۂ آئندہ کی ذہنی اور روحانی ترقیون کو بھی کم سے کم انفرادی طور پر ہم بہت کچھ اپنی مادی زندگی مین حاصل کر سکتے ہین یہی سبب ہے کہ حقیقت شناسان مذہب یعنی صوفیاے کرام نے طلب معرفت مین اس درجہ جہد و کوشش کی ہے اور انسانی ترقی کے وہ نمونے آئندہ کے ذخیرہ سے نکال کر پیش کئے ہین جو عام تجربہ سے دور ہونے کی وجہ سے سرسری نگاہون مین بعید از قیاس معلوم ہوتے ہین۔ مگر یہ ہماری جہالت اور تعصب کی دلیل ہوگی اگر ہم گزشتہ حالات سے سبق نہ لین اور عجلت مین محض عقل کے سرسری فتوے پر اُنسے انکار کر دین۔ البتہ کھوٹے کو کھرے سے پہچاننے کے لئے نظر و فکر کی ضرورت ہے۔

مبادا کوئی یہ خیال کرے کہ مذکورۂ بالا اعتقاد عقیدۂ تناسخ سے ملتا جلتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشتباہ کے خلاف ناظرین کو متنبہ کر دیا جائے اور صاف طور پر بتا دیا جائے کہ مسئلہ تناسخ اور مسئلہ ارتقا میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اکثر صوفیائے کرام کے اقوال پر بھی اسی قسم کا شبہہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مولانائے رومیؒ کے اس شعر میں:۔

هفت صد هفتاد قالب دیده ام   همچو سبزه بارها روئیده ام

تغیرات ارتقائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نہ کہ مسئلہ تناسخ کی طرف۔ اسی کشمکش ارتقا کے ذکر سے مثنوی کی ابتدا بھی ہوتی ہے۔ "نے" کو انہیں منازل ارتقا کی صعوبتوں کی شکایت ہے اور انتہائے کمال کی تلاش ہے۔

بشنو از نے چون حکایت می کند   وز جدائیها شکایت می کند

کز نیستان تا مرا ببریده اند   از نفیرم مرد و زن نالیده اند

سینه خواهم شرحه شرحه از فراق   تا بگویم شرح درد اشتیاق

هر کسے کو دور ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش

مسئلہ تناسخ اس سے ایک جداگانہ اصول کو بیان کرتا ہے اور جیسا کہ یہ مسئلہ جس حد تک پہونچا ہے ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

(۴)
ارتقاے مذہب

مذہب انسان کی خصوصیات مین شمار کیا گیا ہے حیوان ناطق یا کھڑے ہوکر دو پانوٴن پر چلنے والا یا صاحب استدلال وغیرہ وغیرہ جہان اور بہت سی تعریفین انسان کی کی گئی ہین وہان اُسے صاحب مذہب بھی کہا گیا ہے۔ گویا مصداق ع :-

"ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے"

مذہب رکھنا تقاضاے بشریت ہے، اور نہ صرف ہر قوم یا ہر جماعت کا کوئی نہ کوئی مذہب ضرور ہے بلکہ انفرادی طور پر ہر شخص ایک نہ ایک مذہب رکھتا ہے۔ لیکن پہلے معلوم کرنا چاہئے کہ مذہب کی اصل کیا ہے؟ اور کیا واقعی مذہب ایسی چیز ہے جس سے کوئی خالی نہین ہے؟ پھر آخر مذہب کسکو کہتے ہین؟

عام معنی مین مذہب کے لئے بعضون کے نزدیک خدا کی ہستی کا ماننا ضروری ہے۔ خواہ ماننے والا اُسے واحد مانے یا متعدد اور خواہ اُسے صفات جسمانی سے متصف سمجھے یا اُسکا اقرار تقدس و تنزیہ کے ساتھ کرے

اس معنی مین عالم کے تمام مذاہب مشترک سمجھے جاتے ہین - اور خدا کو نہ ماننے والا "لا مذہب" کہلاتا ہے - لیکن اگر ہم اس بات کی تحقیق کرین کہ انسان کو کب اور کیون خدا کا خیال پیدا ہوا تو معلوم ہو گا کہ الوہیت پر یقین رکھنا مذہب کا بنیادی عقیدہ نہین ہے بلکہ کچھ اور ہے - اگرچہ اس بنیادی عقیدہ کے ساتھ خود بخود خدا کا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ عقیدہ اساسی مرنے کے بعد دوسری زندگی کا خیال ہے - اسی عقیدہ کے ساتھ اعمال نیک و بد اور اُنکی جزا و سزا کا یقین وابستہ ہے - اب اس سزا و جزا کا اختیار اگر کسی کے ہاتھ مین ہے تو لازمًا اُسکی حکمرانی اپنے اوپر تسلیم کرنا پڑیگی - اور اس حکمرانی کا استحقاق قدرتًا جب ہی ہم قبول کر سکتے ہین کہ اُسے خالقِ کائنات بھی تسلیم کر لین - لیکن اگر ہم اعمال نیک و زشت کا ایک لازمی نتیجہ جزا اور سزا کو تسلیم کر لین تو خدا کی ہستی کے اقرار یا انکار کی فوری ضرورت جاتی رہتی ہے - یہی سبب ہے کہ بعض مذاہب نے جن مین بودھ کا مذہب خاص طور پر قابل ذکر ہے خدا کی ہستی سے کوئی بحث نہین کی ہے -

اس مین کوئی شک نہین کہ مصنوعاتِ عالم کو دیکھ کر صانع قدرت کا

خود بخود خیال دل مین پیدا ہوتا ہے۔ لیکن صناعی کا تجربہ انسان کو ابتدا ہی مین نہین حاصل ہوتا بلکہ کارخانۂ عالم کے مشاہدہ کے کچھ عرصہ کے بعد صانع اور مصنوع کا مفہوم ذہن مین پیدا ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان کی ذہنی ترقیون کی گزشتہ تاریخ اگر ہمارے سامنے نہ بھی موجود ہو جب بھی ہم بچپن سے آجتک کے خیالات اور باطنی احساسات کو اپنے پیش نظر رکھکر بہت کچھ معلوم کر سکتے ہین۔ ہمارے تجربات کی ابتدا تغیرات عالم سے ہوتی ہے اور انھین تغیرات تک ہمارا مشاہدہ محدود بھی ہے۔ انسان کو خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جو صورتین فنا ہو گئین وہ کہان گئین؟ مجھے خوب یاد ہے کہ بچپن مین دن اور رات کی تبدیلی دیکھکر اکثر غور کیا کرتا تھا کہ کل کا دن کہان چلا گیا اور آج کا دن کہان سے آیا۔ بعض وقت یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ وہی دن اور رات بار بار لوٹ کر آتے ہین اور جتنے عرصہ تک غائب رہتے ہین کسی پوشیدہ مقام پر جا کر چھپ جاتے ہین۔ مجھے افسوس کے ساتھ اقرار ہے کہ اس بارے مین مین اب بھی ویسا ہی لاعلم ہون جیسا پہلے تھا۔

پھر نوع ستارون، ماہتاب، آفتاب کا طلوع وغروب، دن اور

بات کی تبدیلیاں، آندھی اور مینھ کا آنا، پھر آسمان کا کھل جانا، یہ اور اسی قسم کے تمام چھوٹے بڑے تغیرات جنکا تجربہ روزمرّہ کی زندگی مین ہم کو ہوتا ہے فطرت ہمین اُنکی حقیقت دریافت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جو چیز ہم کو پریشان کرنے والی ہے وہ خود اپنے فنا ہونیکا یقین ہے ہم دوسرون کو مرتے دیکھتے ہین اور رفتہ رفتہ یہ یقین دل مین راسخ ہوجاتا ہے کہ ہم پر بھی یہی کیفیت گزرنے والی ہے، گو قدرتاً اُسکے لئے ایک زمانہ بعید اپنے دل مین مقرر کرتے ہین مگر سفر نہین دیکھتے۔ اس صورت مین اپنی بقا کی فطری خواہش ہمارے دل مین ایک دوسری زندگی کا خیال پیدا کرتی ہے اور یہین سے مذہب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے جو کچھ باتین اس قسم کے غور و فکر کے بعد پیدا کی ہین وہ کوئی واقعیت بھی رکھتی ہین یا محض نفس کا دھوکا ہین اور بقول مرزا غالب

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس بات کی تحقیق کرنے کے لئے کہ عقائد مذہبی جن کو بلا تخصیص کسی مذہب اور کسی عقیدہ کے ہم مذہبی نظریات یا کلیات کہہ سکتے ہین

کوئی اصلیت رکھتے یا رکھ سکتے ہین یا نہین، ہم کو دوسری قسم کے عقائد یا نظریات پر نظر ڈالنی چاہیے جنھین ہم نظریات فلسفہ سے تعبیر کرتے ہین۔ جہان تک کہ صرف اصلیت کے امکان کی بحث ہے یہ کہنا کچھ بیجا نہین ہوگا کہ جس دماغ یا ذہن نے ایک قسم کے نظریات یعنی نظریات سائنس قائم کئے اور وہ بعض حالتون مین صحیح ثابت ہوئے، اُسی دماغ اور ذہن نے دوسری قسم کے نظریات یعنی عقائد مذہبی پیدا کئے ہین اور اس لئے اُنکی صحت پر بھی یکسان بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ یعنی عقائد فلسفی ہون، یا عقائد مذہبی دونو نکے صحیح یا غلط ہونے کا یکسان امکان ہے۔ پس سب سے پہلی بات جو ہمین ذہن نشین کرلینی چاہیے وہ یہ ہے کہ مثل نظریات سائنس کے عقائد مذہبی کے لئے بھی یہ جائز نہین ہے کہ بغیر تحقیق کئے ہوئے سرسری طور پر ہم اُسے غلط یا ناقابل توجہ قرار دین۔ پہلے ہم کو دیکھنا ہے کہ عقائد فلسفہ یعنے نظریات سائنس کو ہم کیونکر صحیح مان لیتے ہین۔

نظریات سائنس کی تصدیق کے لئے حسب ذیل اصول قائم کئے گئے ہین:-

(۱) جن واقعات کو سمجھانے کے لئے یہ نظریات قائم ہوئے ہین اُن

واقعات کے کافی تجربہ اور مشاہدہ کے بعد اُنکا قائم ہونا لازمی ہے۔

(۲) مذکورہ بالا واقعات کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اِن نظریات کو ماننا یا تو ضروری ہوتا ہے یا ان سے کافی مدد ملتی ہے۔

(۳) ان نظریات کو ماننے کے بعد منطقی طور پر جو نئے نتیجے ہم اخذ کرین اُسکی تصدیق واقعات سے ہونی چاہیئے۔

(۴) کسی مسلمہ نظریہ سے مخالفت نہ پیدا ہو۔ لیکن اس صورت مین مخالفت جائز ہے کہ سابق سے بہتر کوئی نظریہ پیش کیا جاسکے۔

یہ وہ اصول ہین جن کے مطابق ایک ماہر سائنس ہی کسی دوسرے سائنس دان کے قائم کئے ہوئے نظریہ کی جانچ کرسکتا ہے ورنہ عوام الناس کے لئے صرف یہ اعتبار کافی ہوتا ہے کہ کسی زبردست فلسفی یا سائنسدان نے اس نظریہ کو دریافت کیا ہے اور اُسکے دوسرے ہم پیشہ ماہرین نے جانچ کرکے اس نظریہ کی تصدیق کردی ہے۔

اس صورت مین مذہب کی طرف سے کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح فلسفی عقائد کی جانچ اور تصدیق کے اصول ہین اُسی طرح مذہبی عقائد کی جانچ کے بھی اصول ہین۔ لیکن اس جانچ کا حق صرف ماہرین مذہب ہی کو

حاصل ہے اور عوام الناس کا فرض ہے کہ وہ صرف ماہرین پر اعتماد
کرکے ایمان بالغیب پر عمل کرین - مذہب کے اس مطالبہ مین کچھ نہ کچھ وزن
ضرور ہے - لیکن جو خاص دقت واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اپنے
عقائد کو اُس حیثیت سے نہین پیش کرتا ہے جس طرح فلسفیانہ عقائد پیش
کئے جاتے ہین اور یہی سبب ہے کہ کسی فلسفی عقیدہ کے ماننے مین انسان
کو وہ تامل نہین ہوتا جو مذہبی عقیدہ کے تسلیم کرنے مین ہوتا ہے -

گزشتہ صفحون مین جابجا یہ دکھلایا گیا ہے کہ مذہب اور فلسفہ دونون
ایک ہی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے پیدا ہوئے اور دونونکی غایت
بھی ایک ہی ہے - اس طرح گویا دونون مین حقیقی اختلاف نہین لیکن
اسکا یہ مقصد نہین کہ دونون مین کوئی چیز مابہ الامتیاز نہین ہے - جہان
دونون حقائق اشیاء کے متلاشی اور طلبِ عرفان کے مدعی ہین وہان دونو
کا میدانِ عمل اور ذرائع جُداگانہ ہین اور انھین ذرائع کے اختلاف کی
وجہ سے ایک کو دوسرے پر اعتراض کرنے کا موقع حاصل ہے - ہم
ان اختلافات سے چند کا ذکر کرتے ہین -

(۱) فلسفی اپنے عقیدہ مین ہر وقت ترمیم کرنے کیلئے تیار رہتا ہے

بشرطیکہ مضبوط دلائل اُس عقیدہ کے بطلان کے موجود ہون - لیکن مذہبی اپنے عقائد کو اٹل اور خدائی قانون کا ماتحت بتاتا ہے -

(۲) سائنس وفلسفہ کے ماہرین جو نظریات قائم کرتے ہین اُنکے عملی نتائج کو وہ ہر وقت مشاہدہ کرانے کے لئے تیار رہتے ہین - برخلاف اسکے ماہرینِ مذہب بھی اگرچہ عملی نتائج کے مُدعی ہین لیکن اُنکے مشاہدہ کے لئے اس قسم کے شرائط پیش کرتے ہین جو خود مذہبی عقائد کو تسلیم کرنے کے برابر ہین -

(۳) فلسفی اپنے عقائد کو تسلیم کرنے کے لئے کسی کو مجبور نہین کرتا لیکن مذہبی اپنے عقائد کے ماننے یا نہ ماننے کا لازمی نتیجہ جزا و سزا کو قرار دیتا ہے -

(۴) فلسفہ تمام ترقیات مادّی و ذہنی حتیٰ کہ خود فلسفیانہ عقائد مین "ارتقا" یعنے درجہ بدرجہ ترقی اور تبدیلی کو تسلیم کرتا ہے اور آئندہ کے تغیرات کا بھی حامی ہے - مذہبی اپنے مذہب کو کامل و مکمل بتاتا ہے اور ایک طریقہ پر ارتقائی تغیرات کا مُنکر ہے -

اِن مین سے آخری اعتراض سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے - اِسلئے

کہ اگر ایک مرتبہ یہ بات طے کر لی جائے کہ آیا مذہب مین بھی قانون
ارتقا کا ویسا ہی عمل ہے جیسا کہ انسانی زندگی کے اور شعبون مین ہے
تو بقیہ اعتراضات بہت بڑی حد تک رفع ہو جاتے ہین - یا کم سے کم
انکا جواب دینا آسان ہو جاتا ہے - مین نے جا بجا اس بات کیطرف
اشارہ کیا ہے کہ مذہب بھی قانونِ ارتقا کا ویسا ہی پابند ہے جیسا کہ اور
چیزین ہین - اسی کی اس مقام پر کسی قدر توضیح کرنا چاہتا ہون -

مذہب اور فلسفہ دونون تغیراتِ عالم کے مشاہدہ سے وابستہ
ہین - لیکن جب تک یہ مشاہدات عالم مادی اور حواس ظاہری تک محدود
رہتے ہین اُن سے فلسفیانہ یا موجودہ اصطلاح کے مطابق سائنٹفک
نتائج اخذ ہوتے ہین - لیکن جب انسان ظاہر سے گذر کر اپنے نفس کے
اندر تغیرات کا مشاہدہ شروع کرتا ہے تو مذہب کی ابتدا ہوتی ہے - فلسفے
صرف اُن قوانین قدرت سے بحث کرتا ہے جن کا تعلق عالم ظاہر یا اشیات
مادی سے ہے - مذہب ان قوانین کو عالم باطن یا بہ الفاظ دیگر روحانیات
تک وسعت دیتا ہے - فلسفہ تغیراتِ عالم کی ایک محدود زمانہ کے اندر
کی تاریخ بیان کرتا ہے ، مذہب ان تغیرات کی ابتدا اور انتہا کا پتہ دیتا ہے

لیکن جس طرح فلسفیانہ انکشافات مین اصول ارتقاء کے مطابق انسان نے
ترقی کی ہے اُسی طرح الہام مذہبی بھی قانون ارتقاء سے مقید رہا ہے۔ اسمین
کوئی شبہہ نہین کہ جس حقیقت عظمیٰ کی دونون کو تلاش ہو وہ ایک غیر متغیر
اور مستقل ہستی ہے۔ لیکن اُسکے عرفان کے مقامات اور منازل ہین۔ اور
یہی مدارج ارتقا ہین جو کسی طرح ختم نہین ہوتے۔ "مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ مذہب بھی قانون ارتقا کا ویسا
ہی پابند ہے جیسا کہ فلسفہ، اور عقائد مذہبی اور عقائد فلسفی دونون کی صحت
یا عدم صحت کا یکسان امکان ہے۔ اگر ہم عالم باطن کے وجود کو بھی
تسلیم کرلین تو مذہب کی بنیاد بھی کم سے کم اتنی ہی مضبوط ہوجاتی ہے جتنی
کہ فلسفہ کی۔ لیکن عالم باطن کے وجود کا ثبوت اول تو خود ایک مستقل
بحث چاہتا ہے۔ دوسرے چونکہ باطن کا تعلق بیشتر کیفیات سے ہی
اور کیفیات باطنی یا واردات قلبی پوری پوری بیان مین نہین آسکتین
پھر ضرورت ہے کہ بیان کرنے والا خود صاحب کیفیت ہو اور سُننے والا
صاحب ذوق ہو اس لئے اس دوسرے عالم کے حقائق کی بحث کو
چھیڑنا اس مضمون کی وسعت سے باہر قدم رکھنا ہے۔

اسوقت صرف اتنا کہدینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قوت شاعرہ کو عالم مادّی کے تغیرات کا احساس ہوتا ہے اُسی طرح وہ اپنے اندر بھی تغیرات کا ادراک کرتی ہے - خارجی تغیرات اور تجربات سے جو یقین پیدا ہوتا ہے وہ عقائد فلسفی کے تحت مین ہے اور اندرونی مشاہدات سے عقائد مذہبی کا یقین ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ بمقابلہ ایک فلسفی کے ایک مذہبی اپنے یقین پر زیادہ مستحکم ہوتا ہے - اور اُسکے صحیح ہونے پر زیادہ اصرار کرتا ہے اس لئے کہ خارجی چیزون کے وجود پر ہم اُتنا اعتماد نہین کرسکتے جتنا کہ اپنے نفس کے وجود پر - پس اسوقت اتنی بات تسلیم کرکے کہ تجربات خارجی کے علاوہ مشاہدات باطنی بھی ایک وجود رکھتے ہین اور اس طرح گویا عالم باطن ایک نہ ایک معنی مین موجود ہے، ہم صرف اس بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہین کہ اصول ارتقا کا مذہب پر کیا اثر ہے -

ظاہری قیود و رسوم کے پابند ممکن ہے کہ یہ تسلیم کرنا گوارا نہ کرین کہ مذہب مین بھی اصول ارتقا کے مطابق ضرورت زمانہ کے لحاظ سے برابر تبدیلیان ہوتی آئی ہین - لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار خود مذہب کی بنیاد کو متزلزل کر دیتا ہے، اس لئے کہ پھر روحانی ترقی

کے کوئی معنی نہین باقی رہجاتے اور کیفیات باطنی غیر متغیر قرار پاتی ہین حالانکہ خود مذہب کی تعلیم اسکے خلاف ہے۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ جہان تک کیفیات روحانی ومشاہدات باطنی کا تعلق ہے ضرور ان مین مدارج ترقی پائے جاتے ہین لیکن عقائد مذہب یعنے وہ قوانین جن کی مدد سے یہ مدارج ترقی سطے ہوتے ہین غیر متغیر ہین تو ایسی صورت مین سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اصول سے معلوم ہونیکا ذریعہ کیا ہے۔ کیا کبھی کسی شخص پر یہ اصول بغیر روحانی مدارج ارتقا کو طے کئے ہوئے منکشف ہوئے ہین یا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ یہ اور بات ہے کہ کسی کو یہ روحانی ترقی کسب وریاضت سے حاصل ہوئی ہو یا خود فطرت نے اسکی تخلیق اس مرتبہ پر کی ہو اور حقائق مذہب کے انکشاف کے لئے اُسے منتخب کیا ہو جیساکہ پیغمبرون کی بابت یقین کیا جاتا ہے۔ بہر حال مدارج کا ہونا ضروری ہے۔ اور اگر صاحب مشاہدہ کے لئے مدارج ومنازل ہین تو انکشاف حقیقت بھی انھین مدارج کی مناسبت سے ہوگا۔

مختلف جگہون پر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے جمادات سے لے کر انسان تک جو ارتقائی حالتین اجتماعی طور پر

گزری ہین وہ ہر انسان پر علیحدہ علیحدہ بھی گزری ہین - یہی حالت بعض مذہبی عقائد کی بھی ہے - اس لئے اصول مذہبی کے مدارج ارتقا کے مطالعہ مین ہم کو جہان تاریخ مذاہب سے مدد مل سکتی وہان انفرادی طور پر بھی جو تغیرات کسی شخص کے مذہبی خیالات مین ہوئے ہین ہماری رہنمائی کر سکتے ہین -

اس نظر سے جب ہم مذہب کے عقیدۂ اساسی یعنی مسئلۂ آخرت یا موت کے بعد دوسری زندگی کے مسئلہ کو دیکھتے ہین تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ابتدائی خیالات اس سے زیادہ کچھ نہین تھے کہ مرنے کے بعد وہ ایک دوسری دنیا مین چلا جاتا ہے جہان کے تمام کاروبار بجنسہ ایسے ہی ہین جیسے کہ اس دنیا کے - انسان اسی طرح کھاتا پیتا چلتا پھرتا ہے بلکہ اپنی خورش و پوشش کے متعلق بہت سی باتون مین اپنے متعلقین کا محتاج بھی رہتا ہے اگرچہ وہ اپنے قبیلہ یا اپنے خاندان والون کی فلاح و بہبود یا مصیبت و کلفت کا بھی ذمہ دار تسلیم کیا جاتا ہے - زمانۂ گزشتہ کی تقریبًا کل قومین اور زمانۂ حال کی بھی جاہل قومین ابتک ایسے ہی عقائد رکھتی ہین اور اپنی اپنی معاشرت کے نمونے پر آئندہ زندگی کو قیاس

کر کے مُردون کی ضرورتون کو پوری کرنے کی کوشش کرتی ہین۔ عِندئہ قدرا مصر کی قبرون کو کھولکر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ضروریات زندگی اُنکے ساتھ دفن کردی جاتی تھین۔ اسی طرح بعض قومون مین دستور تھا کہ رؤسا اور اُمرا کے ساتھ اُنکے لونڈی غلام، اور کبھی کبھی بیویان بھی دفن کردی جایا کرتی تھین۔

ان سے ترقی کرکے اُن مذاہب کی باری آتی ہے جو تناسخ کے قائل ہین اور انسان کی آئندہ زندگی کو بالکل موجودہ زندگی کا لازمی نتیجہ قرار دیتے ہین۔ اُنھون نے اتنی ترقی ضرور کی کہ آئندہ زندگی کو ایک حکیمانہ اصول پر اس زندگی کے ساتھ وابستہ کیا لیکن دوسرے عالم کو مادّی قیود سے آزاد کرنے کی کوشش مین اُنھون نے ایک طور پر اُس عالم ہی سے انکار کردیا اور پھر بھی رُوح کو مادّہ سے آزاد نہ تصور کرسکے اور مجبوراً اُسکو دوبارہ اسی دُنیا مین واپس لانا پڑا۔

سب سے بلند مرتبہ اُن مذاہب کا ہے جنھون نے روح کو عالم آخرت مین نہ صرف مادّی قیود سے آزاد سمجھا ہے بلکہ اس دوسرے عالم مین بھی اصول ارتقا کے مطابق ارواح کو مدارج عرفان کے طے کرنے کے قابل

سمجھتے ہین یہان تک کہ بمصداق يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّهِمْ سب سے آخر مرتبہ عرفان کا دیدار الٰہی قرار دیتے ہین اور اسکی بشارت تمام رو حونکو دی گئی ہے جو اس عالم مین آرزومند ہین -

توحید یا تصور معبود مین جو درجے مختلف مذہبون مین پائے جاتے ہین وہ سب سے زیادہ سبق آموز ہین - لیکن چونکہ توحید کا تعلق صرف مذہب ہی سے نہین ہے بلکہ اُسکا اظہار ایک نہ ایک طریقہ پر انسان سے ہر حالت مین ہوتا رہتا ہے اس لئے اُسکی بحث علٰحدہ کی جاتی ہے -

(۵)

توحید و الوہیت

عقیدۂ توحید ودیعت ربّانی اور فطرتِ انسانی ہے۔ مذہب ہو یا فلسفہ دونون ایک نہ ایک صورت مین توحید پر ایمان رکھتے آئے ہین اور ہمیشہ ایسا ایمان رکھنے پر مجبور رہین۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہین۔ ~~

دل گواہ است کہ در پردہ دِل آرائے ہست
ہستیِ قطرہ دلیل است کہ دریائے ہست

اسی لئے مین نے اسکو مذہب اور فلسفہ کے درمیان مابہ الامتیاز نہین قرار دیا۔ لیکن عموماً مذہب مین خدا پر ایمان رکھنے کی جو اہمیت ہے اُس سے مجھے انکار نہین۔ خاصکر ارتقاے مذہب کو سمجھنے کے لئے جتنی مدد عقیدۂ الوہیت کی رنگارنگی سے ملتی ہے کسی اور عقیدہ سے نہین ملتی۔

سابق مین جس جگہ اس فلسفیانہ اصول کا ذکر کیا گیا ہے کہ زمان

و مکان وغیرہ کا عقیدہ داخل فطرتِ انسانی ہے وہاں مذہب کی طرف سے یہ دعوے پیش کیا گیا ہے کہ خدا کا یقین بھی داخلِ فطرت ہے۔ اب اس موقع پر اسی عقیدہ کی کسی قدر توضیح کیجاتی ہے۔

عقیدۂ توحید کے داخلِ فطرت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو بغیر کسی دلیل کے خود بخود اس بات کا یقین ہے کہ تمام چیزوں کی حقیقت ایک ہی ہے اور وہ ہمیشہ دوئی سے گھبراتا ہے اور کثرت میں وحدت کی تلاش کرتا رہتا ہے۔ متفرق اور متعدد تجربوں سے ایک کلیہ کا اخذ کرنا اسی تقاضائے فطرت کی دلیل ہے اور تمام علوم حکمت و فلسفہ جن کو آجتک ذہن انسانی نے مدوّن کیا ہے اس فطری یقین کا ثبوت دیتے ہیں۔ مثالاً تحقیق مادہ کے مدارج کا ذکر مناسب ہوگا۔

عالم اجسام مادّی کی کوئی انتہا نہیں۔ انسان نے پہلے اُنکی کثرت کو ذہن سے اس طرح کم کیا کہ مختلف چیزوں کو جو ظاہری شکل و صورت میں یکساں ہونے کے علاوہ افعال و خواص میں بھی یکساں تھیں ایک قسم خاص کے ماتحت قرار دیا اور اس طرح جزئیات سے کلیات پیدا کئے۔ لیکن کثرت پھر بھی موجود تھی اس لئے اُن عناصر کی تلاش

شروع کی جس سے تمام قسمون کی چیزین مرکب ہین - اِن عنصرون کی تعداد زمانۂ حال کی تحقیقات کے مطابق تقریبًا چوراسی ہین - اب اُس نے اِن عناصر کی طرف توجہ کی اور اُن کی کیمیائی اور طبیعی خصوصیتون پر نظر ڈالکر اُنکی آٹھ قسمین قرار دین اور یہ کلیہ قائم کیا کہ جتنے عنصر کسی ایک قسم کی تحت مین ہین وہ دراصل ایک ہی ہین - لیکن کسی خاص اندرونی تغیر کی وجہ سے بعض بعض خاصیتون مین ایک دوسرے سے مختلف ہین - جس طرح کسی ایک نوعیت کے عنصرون کو ترتیب وار رکھنے مین یکے بعد دیگرے تھوڑا تھوڑا فرق بلحاظ افعال وخواص کے معلوم ہوتا تھا اُسی طرح عنصرون کی آٹھون قسمون پر بھی جب نگاہ ڈالی جاتی تھی تو ایسا ہی فرق مراتب نظر آتا تھا - مجبورًا جماعت محققین کو یہ حکم لگانا پڑا کہ مادہ کی تمام قسمین واحد ہین اور جو فرق نظر آتا ہے وہ صرف قوت برقی کی کمی بیشی کی وجہ سے ہے - اس طرح پر گویا تمام کائنات کا دارومدار صرف دو چیزون پر قرار پایا، یعنی مادہ اور قوت لیکن فطرت اب بھی وحدت کی جویا تھی - بالآخر مزید تحقیقات اور علمی انکشافات سے یہ نتیجہ نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ مادہ فی ذاتہ کوئی چیز

نہین ہے بلکہ صرف قوت برقی کے ایک جگہ جمع ہوجانے اور مرکز قائم کرلینے سے اُن مادّی ذرّون کا وجود پیدا ہوا ہے جو برقیات کہلاتے ہین - ان برقیات کے مختلف تعداد مین اکٹھے ہونے سے مختلف عنصری ذرّے یا سالمات وجود مین آئے ہین اور مختلف عنصری ذرّون کی باہمی ترکیب سے دوسرے اجسام بنے ہین جو مرکب کہلاتے ہین - تلاش اب بھی ختم نہین ہوسکتی اس لئے کہ فضائے بسیط کے اب بھی دو حصے معلوم ہوتے ہین - ایک وہ جو ذرّات مادّی یا یون سمجھئے کہ قوت برقی کے اکٹھے ہوجانے سے پُر ہے اور دوسرا وہ حصہ جو خالی ہے -

اگر یہ کہا جائے کہ فضائے بسیط کہین خالی نہین ہے بلکہ ایتھر سے بھری ہوئی ہے جب بھی ایتھر اور مادہ یا ایتھر اور قوت کی دوئی باقی رہجاتی ہے - اسکے علاوہ قوت برقی و مقناطیسی کے ساتھ ساتھ مادّہ مین کشش ثقل ایک نئی قسم کی قوت کا اظہار ہے اور بقول جرمن پروفیسر البرٹ آئنسٹین کے علم طبعیات کی تکمیل اُسی وقت سمجھنی چاہیئے جب یہ دریافت ہوجائے کہ کشش ثقل اور کشش برقی مین کیا واسطہ ہے - بہرکیف جب تک دوئی قائم ہے انسانی ذہن کو انتشار اور

جستجو سے نجات نہین۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ توحید مذہبی کو اس قسم کی توحید فلسفی سے کوئی تعلق نہین اور نہ اس توحید سے خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے اور نہ اُسکے ہونے کا کوئی یقین پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مقصود اس بحث سے صرف اتنا ہے کہ انسان خود بخود یقین کرتا ہے کہ سب چیزون کی اصل ایک ہی ہے اور بالطبع دوئی سے متنفر ہے۔

رہی یہ بات کہ اُس اصل واحد کی حقیقت کیا ہے یا بہ الفاظ دگیر خدا کا صحیح تصور کیا ہونا چاہیئے؟ تو مذہبی ہو خواہ فلسفی، رند خراباتی ہو یا عابد شب زندہ دار، کوئی یہ دعویٰ نہین کرسکتا کہ اُس نے معرفت کا حق ادا کر دیا۔ اپنے اپنے مرتبہ پر ہر ایک اُسکو مانتا ہے اور اپنے ہی تصور کی پرستش کرتا ہے۔ جیسا وہ ہے خود ہی خوب جانتا ہے الا ماشاء اللہ۔

کس را بپس پردۂ قضا راہ نہ شد   وز سرِ قدر ہیچکس آگاہ نہ شد
ہرکس ز سرِ خیال چیزے گفتہ است   معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شد

لیکن اس موقع پر صرف اُن مدارج سے بحث ہے جو خدا کے سمجھنے مین مذہب نے طے کئے ہین اور اس لحاظ سے ہم مختلف مذہبون

فرق مراتب قائم کرنا چاہتے ہین -

سب سے ادنی مرتبہ اُن مذہبون کا ہے جنھون نے اسی عالم مادی کی خوفناک یا عظیم الشان ہستیون یا خاندان کے اُن بزرگون کو جو مرچکے ہین پرستش کے لئے منتخب کرلیا ہے - ان مذہبون کے دیکھنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا مین خدا کا خیال انسان کو خوف مصیبت اور موت کی وجہ سے پیدا ہوا اُسکی شان خلق یا شان ربوبیت کا احساس ان مذہبون نے بہت کم کیا ہے -

اِن سے ترقی کرکے وہ مذہب ملتے ہین جو بعض پوشیدہ قوتون کو اس عالم پر متصرف سمجھتے ہین؛ مگر بھی ان قوتون کو مادی اجسام کے ساتھ مقید تصور کرتے ہین - اور آگے بڑھ کر وہ مذہب ہین جو معبودون کی کثرت کے تو قائل ہین لیکن ان سب سے بالاتر ایک ایسی ہستی کو بھی مانتے ہین جو تمام معبودون پر حکمران ہے، اگرچہ براہ راست اس کا کوئی تعلق کارخانۂ عالم سے نہین سمجھتے -

لیکن جہان تک مجھے معلوم ہے یہ فضیلت صرف مذہب اسرائیلی یعنی ملت ابراہیمی ہی کو حاصل ہے کہ وہ صرف ایک معبود کو بلا شرکت غیرے

مانتا ہے اور اُسی کو تمام کائنات کا خالق اور متصرف کل یقین کرتا ہے۔ مذہبِ یہود، مذہبِ نصاریٰ اور مذہبِ اسلام اسی دین حنیف کے متبع ہین۔ بہرحال توحیدِ الٰہی کی تکمیل تخلیق عالم کا ایک لازمی منشا ہے جس کی سرانجام دہی کے لئے ہمارے نقطۂ نظر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منتخب کیا گیا مگر اُس کی تنزیہ کی تکمیل ایک اور منزل چاہتی تھی جس کو مذہبِ اسلام نے طے کیا۔

مذہب یہود اور مذہب نصاریٰ کی کتابون کے دیکھنے سے خواہ یہ کتابین صحیح مانی جائین یا تحریف شدہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہان ان مذہبون نے خدا کی وحدانیت کو تسلیم کیا ہے وہان اُسکے تصور مین بڑی حد تک جسمانیت کو برقرار رکھا ہے۔ اس جگہ یہ کہنا کچھ بے موقع نہوگا کہ ذہن انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ توحید اور اُسکے بعد تنزیہ کی تکمیل ہوئی ہے ظہورِ اسلام کے وقت گویا ادراک انسانی بحیثیت مجموعی اتنا مکمل ہو چکا تھا کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو تمام صفات سے منزہ کر کے سمجھ سکے یا کم سے کم اُسکا کوئی مفہوم قائم کر سکے۔ پس اُسی وقت وہ اس عقیدہ کے لئے مکلف بھی قرار پایا۔

وحدت وجود کا عقیدہ ایک قدم اور آگے ہے۔ یعنے سوائے ایک ذاتِ واحد کے کسی اور کو موجود نہ سمجھنا۔ لیکن چونکہ عام ذہن انسانی اس مرتبۂ توحید کے مشاہدہ کی اہلیت نہین رکھتا اس لئے اسلام نے جہان اس عقیدہ کے لئے راستہ کھول دیا ہے وہان شرعی طور پر کسی کو اس عقیدہ کے ماننے کے لئے مجبور بھی نہین کیا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر یہ بتایا جائے کہ عالم مین سوائے خدا کے اور کسی کا وجود نہین ہے تو چونکہ عوام الناس اس قسم کا کوئی تصور قائم نہین کر سکتے اس لئے اُن کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ ہر چیز خدا ہے لیکن چیزون کو وہ شمار اور اعداد سے پہچانتے ہین اس لئے بجائے وحدت وجود کے کثرت معبود کا مفہوم پیدا کر لیتے ہین جو بالکل برعکس ہے۔

مگر اس کے یہ معنے نہین ہین کہ وحدت وجود کا مسئلہ غلط ہے۔ یا کم سے کم مذہبی نقطۂ نظر سے غیر ضروری مسئلہ ہے۔ بلکہ برعکس اسکے اگر ہم اس بات کا یقین رکھتے ہین کہ اصول اسلام عین فطرت کے مطابق ہین تو ہم کو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ظاہری یا باطنی ترقی مین کسی حد تک پہونچکر رُک جانا تقاضائے ارتقا کے خلاف ہے۔

اور اس لئے عقیدۂ اسلامی کے بھی منافی ہے - پس جب ہم کارخانۂ عالم کا مشاہدہ کرتے ہین اور یہ محسوس کرتے ہین کہ عرفانِ وحدت ہماری فطرت ہے اور وحدت حقیقی صرف اُسی وقت قائم ہوسکتی ہے کہ سوا ایک ہستیِ مطلق کے اور تمام چیزون سے مُنھ پھیر لیا جائے تو بجز وحدت وجود کو تسلیم کرنے کے کوئی چارہ کار نہین معلوم ہوتا - البتہ اس وحدت کے مشاہدے کے بھی مراتب ہین جو منازل معرفت سے تعبیر کئے جاتے ہین لیکن اُن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ مجھے منصب ہے - صاحبانِ نظر اپنی اپنی جگہ پر خود غور کرسکتے ہین اور اگر خدا ہشمند ہونگے تو اکثر سالکانِ طریقت کو رہبری کے لئے مستعد بھی پائین گے - بہرکیف توحید حقیقی وہی ہے جس کا احساس انسان اپنے نفس کے اندر کرے نہ یہ کہ زبانی استدلال پر اکتفا کرے -

ازساحتِ دل غُبارِ کثرت رُفتن　　بہتر کہ بہرزہ دُرِ وحدت سُفتن
مغرورِ سخن مشو کہ توحید خدائے　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

الوہیت کے متعلق اجتماعی حیثیت سے علحدہ ہو کر بھی ہر شخص اپنے

حافظہ پر زور دیکر معلوم کرسکتا ہے کہ جیسے جیسے اسکا ذہن ترقی کرتا گیا اُسکے خیال مین کیا کیا ترقیان ہوئین اور کن مراتب کو طے کرکے وہ اب کہان پہونچا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ منزل مقصود تک پہونچنے یا نہ پہونچنے کی ذمہ داری ہم پر نہین بلکہ فطرت کا منشا طلب کرنا اور صرف طلب کرنا ہے۔ نتیجہ کا خیال بے نتیجہ ہے۔ ؎

ہمارے ذہن مین اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہو تو کہان جائین؟ ہو تو کیونکر ہو؟

وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ یہی ہمارے دائرۂ عمل کی انتہائی حد ہے اور اسی کے اندر تمام مدارج ارتقا یا منازل عرفان واقع ہین۔ باقی کچھ نہین۔

---

(۶)

الہام اور نبوت

اس سے پہلے کسی جگہ پر مذہبی اور فلسفی عقائد کی تفریق کرتے ہوئے اُن اعتراضوں کی تفصیل کی گئی ہے جو مذہب پر بمقابلہ فلسفہ کے عائد ہوتے ہین - ان مین سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا مذہبی عقائد بھی اصول ارتقا کے ماتحت ہین یا نہین ؟ -

جو بحث اب تک کی گئی وہ صاف ثابت کرتی ہے کہ مذہب اس قانون سے مستثنٰی نہین ہے - اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذہبی قانون کبھی ناقابل ترمیم نہین تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً اُس مین ترمیم ہوتی رہی ہے - البتہ جو بات مذہب نے بمقابلہ فلسفہ کے اپنے لئے مخصوص کر لی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کی ترمیم یا تنسیخ بذریعہ وحی اور الہام کے ہوئی ہے اور اسکے لئے خاص خاص وقتون مین نبی اور رسول مبعوث ہوئے ہین جو مامور من اللہ تھے - اس طرح اہل مذہب بانیان مذہب کی

ہستیون کو پُراسرار اور مافوق الفطرۃ قرار دیتے ہین اور معجزات، کرامات وغیرہ بہت سی ایسی باتوں کے صدور کو اُن کی طرف منسوب کرتے ہین جو عام طور پر ناقابل یقین اور بعید از عقل معلوم ہوتی ہین۔

عقیدۂ الوہیت اور عقیدۂ رسالت کا اگر باہم موازنہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ جہان توحید ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر فلسفی اور مذہبی دونون کا اتفاق ہے وہان عقیدۂ نبوت صرف مذہب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہان پہونچکر یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ اکثر بزرگان ملت جو بمقابلہ "لا الٰہ الا اللہ" کے "محمد رسول اللہ" کی تعلیم اور تلقین کو زیادہ اہمیت دیتے ہین اُسکی اصلیت کیا ہے؟ - اور خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ایسا کرنا نہ صرف جائز اور مناسب ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔

اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو صرف الہام اور نبوت ہی کے مسئلہ کے حل ہو جانے پر مذہب اور فلسفہ کا تمام اختلاف مٹ جاتا ہے اور اسی کے ساتھ عالمِ آخرت کے یقین کا سوال بھی حل ہو سکتا ہے جو مذہب کا بنیادی عقیدہ قرار دیا گیا ہے۔ جو خاص وقت پیش

آتی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفی اُس وقت تک کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہین ہوتا جب تک کہ تجربہ اور مشاہدہ سے اُسکی زبان بند نہ کردی جائے یا ایسے مضبوط منطقی دلائل نہ پیش کردئے جائین جن سے انکار ناممکن ہو اور دوسری طرف اگر رسمی فلسفہ کی مدد سے کسی عقیدہ کی تائید کی جاتی ہے تو اول تو صحیح معنی مین اُس سے تشفی نہین پیدا ہوتی اور دوسرے معمولی فلسفیانہ استدلال کو اگر صحیح مان بھی لیا جائے تو مذہب کے تمام پُراسرار تقدس کی حقیقت دلی ملمع سے زیادہ وقیع نہین نظر آتی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحب استدلال کو خود کوئی عقیدت مذہب کے ساتھ نہین ہے بلکہ محض بعض مصلحتون کی بنیاد پر وہ اسکی ہستی کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور بس۔

لیکن ایک اور صورت بھی ہے جو اگرچہ بالکل بیان حقیقت نہین ہے لیکن بڑی حد تک تسکین ہو سکتی ہے۔ اس صورت مین مذہب کوئی مافوق الفطرۃ چیز نہین باقی رہتا مگر اُسکی کیفیت اور لذت بھی زائل نہین ہوتی۔ اس صورت کا بیان کسی قدر تفصیل چاہتا ہے جو آگے آتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہمارا علم ہمارے مشاہدات تک محدود ہے۔ جو کچھ ہم مشاہدہ کرتے ہین اُسکا تعلق صرف اشیار کی کمیت اور کیفیت سے ہے۔ یہ کیفیات کبھی خارجی چیزون سے تعلق رکھتی ہین اور کبھی صرف اپنے نفس سے۔ مثلاً اجسام مادّی کے متعلق جو کچھ ہم جانتے ہین وہ اُنکی سختی و نرمی، سردی و گرمی، رنگ و بُو، قد و قامت، حرکت و سکون وغیرہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کیفیات ہین جن کا علم ہمارے ذہن کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ خود وہ اشیا ہین جنکی طرف ان حالتون کی نسبت دی گئی ہے۔ اسی طرح رنج و خوشی، محبت و عداوت، رحم و غصہ وغیرہ ایسی کیفیتین ہین جنکا مشاہدہ ہم اپنے نفس کے اندر کرتے ہین۔ اب جن کیفیات کے احساس مین ہم دوسرون کو بھی اپنا شریک پاتے ہین تو اُن کیفیتون کو ہم عالم ظاہر سے نسبت دیتے ہین۔ مثلاً ایک چیز کو ہم سفید دیکھتے ہین اور ہمارے دوسرے ہمجنس بھی ایسا ہی دیکھنے کا اقرار کرتے ہین تو اس کو ایک امر بدیہی قرار دینگے اور اُس شئے کا وجود اپنے سے خارج تسلیم کرین گے۔

اس موقع پر مین اُس نازک بحث مین نہین پڑنا چاہتا کہ آیا

اشیاء کا وجود خارج مین ہے بھی یا نہین اور نہ اس مسئلہ کی تحقیق مین
کرنا چاہتا ہون کہ جس چیز کو ہم سفید دیکھتے ہین اور دوسرا بھی اُسکے
سفید ہونے کا اقرار کرتا ہے تو کیا سچ مچ اُسکو بعینہ وہی احساس بھی
ہوتا ہے جو ہم کو ہوتا ہے - یہ ایک طویل بحث ہے اور مسائل زیر مطالعہ
کے لحاظ سے اس سے قطع نظر کیا جا سکتا ہے - خلاصہ مقصد صرف
اس قدر ہے کہ جب ہمارے احساس کی تصدیق دوسرون سے بھی
ہو جاتی ہے یا ہونے کا امکان ہوتا ہے تو ہم اس احساس کو خارجی
چیزون سے منسوب کرتے ہین - اسی طرح بعض کیفیات باطنی مثلاً رنج
وخوشی وغیرہ ایسی ہین جو دوسرون پر بھی گزرتی ہین - اگرچہ ممکن ہے
کہ اُن کا موقع اور وقت ہم سے مختلف ہو - ان تمام کیفیات کے لئے
جن کا احساس عام ہے انسان نے الفاظ وضع کر لئے ہین اور اُنکے
ذریعہ سے وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے احساس کی اطلاع دوسرے
کو دیتا رہے - اس طریقہ پر ان کیفیات کی تحقیق وہ خود بھی کرتا رہتا ہے
اور دوسرون کو بھی تحقیق مین مدد دیتا ہے اور اُن سے مدد حاصل
کرتا ہے - جو نظریات انسان اس قسم کے احساس خارجی یا باطنی کے

مستلق قائم کرتا ہے اُسکا واسطہ عالم ظاہر سے ہے یا زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ کہا جائے
کہ اُس کا تعلق عالمِ قال سے ہے۔

لیکن جب خارجی اشیاء کے مشاہدے یا باطنی ادراک سے انسان
ایسی کیفیتوں کو محسوس کرتا ہے جو عام نہین ہین۔ یعنی جن کے احساس
مین دوسرے انسان اُسکے شریک نہین ہین تو وہ اُسکے بیان سے عاجز
ہوتا ہے۔

یہ وہ کیفیتین ہین جو صرف عالمِ باطن یا عالم حال سے تعلق رکھتی
ہین ۔ اس ادراک باطنی کے مختلف مدارج ہین۔ ابتدائی مرتبہ مین جو کیفیت
پیدا ہوتی ہے وہ صرف آنی ہوتی ہے جس طرح نگاہ کے سامنے بجلی چمک
جاتی ہے۔ انسان کو اُسکا فوری احساس ہوتا ہے لیکن قبل اسکے کہ ہم
اُس کی تشخیص کرین وہ حالت زائل ہو جاتی ہے۔ اصطلاح مین اسکو
"حال" کہتے ہین۔ رفتہ رفتہ متواتر تجربہ کے بعد اس حالت مین استقلال
پیدا ہونا شروع ہوتا ہے اور ذہن پر وہ کیفیات زیادہ واضح ہوتی جاتی
ہین حتیٰ کہ راسخ ہو جاتی ہین۔ اس مرتبہ پر پہونچکر "حال" "ملکہ" ہو جاتا ہے
اس ملکہ کی مدد سے انسان اکثر اُن رموز قدرت پر واقفیت حاصل کر لیتے

قابل ہوجاتا ہے جن کو علوم رسمی یا علوم ظاہر سے وہ نہین حل کرسکتا مکاشفہ اور الہام کا تعلق اسی قسم کے ملکۂ باطن سے ہے۔

ملکۂ باطنی کبھی کسبی ہوتا ہے اور کبھی فطری بعض افراد کی غیر معمولی ذہانت اس قسم کے فطری ملکہ کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ اور ایک معنی مین ہم اُس کو غیر معمولی قوتِ کشف یا الہام سے تعبیر کرسکتے ہین۔ دُنیا مین لاکھون مرتبہ سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرے ہونگے اور انسانون نے مشاہدہ کیا ہوگا۔ لیکن اگر الہام نہین تو وہ کون سی قوت تھی جس نے اسی سیب کے زمین پر گرنے کے واقعہ سے حکیم نیوٹن کو قانون کشش ثقل کا یقین دلادیا؟ اسی طرح حکیم ارشمیدس نے جب نہانے کے لئے پانی سے لبریز حوض مین قدم رکھا تو صرف پانی کے چھلک جانے اور اپنے جسم کے وزن مین کمی محسوس کرنے سے اُسکو اس بات کا یقین ہوگیا کہ ہر جسم جتنے پانی کو اپنی جگہ سے ہٹاتا ہے اُتنا ہی اُسکا وزن پانی مین کم ہوجاتا ہے۔ یہ القاے باطنی ایسا قوی تھا کہ حکیم موصوف خود مبہوت ہوگیا اور بے اختیار ننگا حمام سے باہر نکل آیا اور "مین نے پالیا۔ مین نے پالیا" کہتا ہوا اپنے کشف کا اعلان

ہر ایک پر کرنے لگا۔

زیادہ عرصہ نہین گزرا کہ ہندوستان ہی کے ایک گوشہ سے اطلاع ملی تھی کہ ایک نو عمر طالب علم کو یہ غیر معمولی اور خداداد قوت حاصل ہے کہ وہ ریاضی کے بڑے بڑے اور مشکل سوالون کے جواب فوراً دیدیتا ہے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ بڑے بڑے اعداد کا حاصل ضرب صرف اعداد کو سُن کر فوراً لکھدیتا ہے۔ یہ تمام مثالین صاف بتاتی ہین کہ فطرت انسانی مین کس حد تک ترقی کی گنجائش ہے اور مبدء فیاض سے کیسی کیسی قوتین اُسکو عطا ہو سکتی ہین۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قسم کے کمالات اگرچہ مافوق العادت ضرور ہین، یعنی عام طور پر اُن کی مثالین نہین ملین گی مگر مافوق الفطرت نہین ہین بلکہ عین قانون قدرت اور اصول ارتقا کے مطابق ہوتی ہین البتہ کمیاب ہین۔

نبوت بھی ایک ملکۂ فطری ہے۔ اور نبی یا رسول کی حالت اس معنی مین ایک خصوصیت رکھتی ہے کہ وہ مامور من اللہ ہوتے ہین یعنی جو کچھ اُن پر منکشف ہوتا ہے اُس کی بابت اُنکی فطرت صحیحہ کا حکم

ہوتا ہے کہ دوسرون تک پہونچا دین - اور یہی باعث ہے کہ وہ نہ نہ صرف اپنے مکاشفات سے لوگون کو مطلع کرتے ہین بلکہ مدعی نبوت بھی ہوتے ہین -

صاحب مکاشفہ کے لئے خواہ نبی ہو یا ولی سب سے زیادہ دشواری اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب "حال" کو "قال" مین لانا پڑتا ہے - جیسا کہ کہا گیا ہے ان بزرگون کے مشاہدات عام تجربات سے بالکل علیحدہ ہوتے ہین - اس لئے اُن کے لئے انسانی لغت مین صحیح الفاظ موجود نہین ہوتے - پس صاحب مکاشفہ جب ایسی کیفیات باطنی کا ادراک کرتا ہے جو عام طور پر لامعلوم ہین تو وہ معلوم چیزون مین اُن کا مثل ڈھونڈھتا ہے - اس طرح عالم باطن اور عالم ظاہر کے درمیان وہ ایک اور عالم پیدا کر لیتا ہے جس کو عالم مثال کہتے ہین - اسی عالم مثال کی سیر اور مشاہدے کی وسعت انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اُن حقیقتون کو خود سمجھ سکے جن کا اُس کو پہلے سے کوئی علم اور تجربہ نہین تھا اور اسی کی مدد سے وہ اپنے مشاہدات باطنی سے دوسرون کو بھی فائدہ پہونچاتا ہے اور حسب منشاے قدرت اُسکے

علم مین اضافہ کرتا ہے۔

جو کچھ نبوت اور الہام کے متعلق اب تک لکھا گیا ہے وہ اس سے زیادہ نہین ہے کہ ان چیزون سے برجستہ انکار نہ کر دینا چاہئیے بلکہ خود ہماری عقل کا یہ تقاضا ہے کہ اپنا فیصلہ دینے سے پہلے کسی قدر غور و تامل کو کام مین لائین - اس غور و تامل کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہین کہ بعض نفوس مین ایسی پوشیدہ قوتون کا پایا جانا بھی ممکن ہے جو عام طور پر نہین پائی جاتین اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان قوتون کے ذریعے سے ان لوگون پر ایسے حالات منکشف ہو جائین جن سے دوسرے ناواقف ہین - میری دانست مین الہام اور مکاشفہ کے متعلق عقلی دلائل اس سے آگے نہین جا سکتے - لیکن شعور انسانی کو ارتقا ہے جیسا کہ کسی دوسرے مقام پر ثابت کرنیکی کوشش کی گئی ہے - اور اگر الہام اور مکاشفہ ذہن انسانی ہی کا ایک کرشمہ ہے اور مدارج عرفان کی ایک ضروری منزل ہے تو ہم کو یقین رکھنا چاہئیے کہ جیسے جیسے ہماری قوت مدرکہ نئے نئے علمی انکشافات کے ساتھ ترقی کرتی جائیگی ویسے ویسے نبوت اور الہام کا دشوار مسئلہ ہماری فہم سے قریب تر ہوتا

جائے گا - علاوہ اسکے زمانہ موجودہ مین بھی ایسی ہستیان یقیناً موجود ہین جن پر یہ رموز منکشف ہین اور اُنکے فیض صحبت اور اُنکے خیالات اور کیفیات باطنی سے رفتہ رفتہ موانست پیدا کرکے بھی ہر شخص جو طلب صادق رکھتا ہے تشفی حاصل کرسکتا ہے -

اس جگہ پر یہ واضح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظریات مذہب اور نظریات فلسفہ یا جیسا کہ کہا گیا ہے عقائد مذہبی اور عقائد فلسفی دونون کا بیشتر حصہ عالم مثال ہی سے تعلق رکھتا ہے - یعنی جو کچھ ان عقائد مین بیان کیا گیا ہے وہ صرف اس معنی مین بیان حقیقت کہے جا سکتے ہین کہ الفاظ کے ذریعہ سے بہترین مثال جو عالم ظاہر سے ممکن تھی پیش کردی گئی - پس ان الفاظ کے مصداق عالم مثال مین ہین نہ کہ عالم ظاہر مین - نمونہ کے لئے مین دوبارہ گردش زمین کو یاد دلاؤنگا اور اسکے بعد ہر شخص اندازہ کرلے کہ کیا واقعی زمین کے گولے کو جس کا دورچوبیس ہزار میل ہے اپنے تصور مین گردش کرتا ہوا مشاہدہ کرتا ہے یا محض ایک مثالی خاکہ اُسکے پاس ہے - اسی طرح ایتھر کا وجود کم و بیش اس زمانے کے

تمام محققین مانتے ہین لیکن جس وقت اُسکے تمام افعال وخواص کو معلوم کرنے کے بعد ہم کوئی کامل نمونہ معلوم چیزون مین ڈھونڈھتے ہین تو ناکامیاب رہتے ہین - پھر بھی بعض مشاہدات کی بنیاد پر اُسکا یقین رکھتے ہین -

ایساہی مشکل پروفیسر البرٹ آئنسٹین کے اس تازہ ترین عقیدہ کو سمجھنا ہے کہ کائنات متناہی مگر غیر محدود ہے - پروفیسر موصوف کے دلائل بہت مضبوط ہین اور سمجھ مین آسکتے ہین لیکن جس وقت ہم ایک ایسی چیز کے وجود کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہین جو متناہی ہو یعنی ایک مقررہ مقدار سے زیادہ نہو اور اسی کے ساتھ غیر محدود بھی ہو یعنی اُسکے حدود غیر معین یا غیر مشخص ہون تو چونکہ ہم کو کسی ایسی شی کا مشاہدہ نہین ہوا ہے ہم کوئی تصور فوراً نہین قائم کرسکتے - البتہ بعض مثالون کی مدد سے اور متواتر خیال پر زور دینے سے کچھ دھندلا ساخاکہ کسی کسی نے قائم کیا ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہین معلوم ہوتی -

مذہبی عقائد مین بہشت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ بہت سی ایسی چیزون کا

ذکر ہے جن کا وجود مثالی ہے نہ کہ مادی۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی ذی فہم کے لئے ان چیزوں کے مادی وجود کا ماننا نہ صرف دشوار ہے بلکہ سمجھ بوجھ کر ایک غلط شئے کا اقرار کرنا اس کے ذمہ اخلاقی گناہ بھی عائد کرتا ہے۔

بہرکیف نبوت اور الہام کے متعلق جہاں تک الفاظ نے میری مدد کی مین نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر مین جانتا ہون کہ پوری تشفی کے لئے اس سے کچھ زیادہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ چیز کاغذ اور روشنائی مین نہین مل سکتی۔ البتہ ایک آخری بات لکھ کر عنوان زیر بحث سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہتا ہون۔ یعنی اگر ملکہ نبوت یا الہام اور وحی کی حقیقت تسلیم بھی کر لیجائے تو کیونکر یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص نبوت یا رسالت کا دعویدار ہے واقعی صاحب وحی بھی ہے؟ کیا یہ بات نہین ممکن ہے کہ کوئی جھوٹ موٹ لوگونکو دھوکا دے کر اپنا گرویدہ بنانے کے لئے اس قسم کا دعوی کرتا ہو؟

میرے پاس اس کا جواب بہت مختصر ہے۔ یعنی مدعی نبوت یا بانی مذہب کے حالات زندگی اس کے دعوی سے پہلے اور اسکے

دعوے کے بعد جو صحیح اور معتبر شہادتوں کے ذریعے سے ہم تک پہونچے
ہوں صرف وہ مدعی کے صادق یا کاذب ہونے کی بہت کافی دلیل
ہوسکتے ہیں۔ اور جتنے صحیح اور بکثرت واقعاتِ زندگی اُس کے ہم کو
معلوم ہونگے اُتنا ہی اُس کی صداقت نفس کی جانچ کا ہم کو زیادہ
موقع ہوگا اور جانچ کے بعد اُتنا ہی زیادہ ہم اُس کی تصدیق کرسکینگے
یہ چونکہ بالکل ظاہر اور واضح طریقہ ہے اسلئے کسی مزید تفصیل کی ضرورت
نہیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

(۷)

کفر و اسلام

الہام اور نبوت کو اگر ہم فلسفیانہ دلائل سے ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی یہ اعتراض باقی رہجاتا ہے کہ آخر انسان الہامی عقائد کو ماننے کے لئے کیون مکلف بنایا گیا ہے اور کیون مذہب کی طرف سے منکرین کو طرح طرح کے عذاب کی دھمکیان دی گئی ہین۔ اسی کے ساتھ ختم نبوت کا مسئلہ ہے جو اگرچہ بظاہر اسلامی مسئلہ معلوم ہوتا ہے لیکن تقریبًا تمام اہل مذہب اپنے اپنے مذہب کو بمقابلہ دوسرے مذہبون کے سچا اور واحد ذریعۂ نجات قرار دیکر ایک طور پر اپنے اپنے مذہب کے بانی کے ساتھ الہام اور وحی کو ختم کر دینا چاہتے ہین۔ میری دانست مین ان دونون باتون کا جواب سرسری اور رسمی طور پر دینا خطرہ سے خالی نہین ہے۔ اسی کتاب کے دوسرے حصہ مین اگر ممکن ہوا تو زیادہ وضاحت کے ساتھ ان مسائل سے بحث کیجائے گی

البتہ اس جگہ چند الفاظ مین کفر و اسلام یا لامذہبی اور مذہب کی تفریق کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور کیا عجب ہے کہ آئندہ چل کر مسائل مذکورہ کے حل کرنے مین بھی اس تفریق سے کچھ مدد مل سکے۔

مین نے اسلام اور مذہب کو اور اسی طرح کفر اور لامذہبی کو مرادف قرار دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمانون کو اس پر کوئی اعتراض نہین ہو سکتا اس لئے کہ بتایا گیا ہے کہ "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" یعنی "دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے۔" لیکن دوسرے مذاہب کے نقطۂ نظر سے یہ ضرور ایک قسم کا تعصب معلوم ہو گا۔ مگر جس وقت اسلام کی تشریح اور اسکے واقعی معنے بتا دئے جائین تو کوئی وجہ نہین کہ ہر شخص کسی مذہب پر جس کو وہ سچا سمجھتا ہو اسلام کا اطلاق ناجائز قرار دے۔

"اسلام" کے معنے ہین "سر جھکانے" کے اور دوسرا مفہوم اسکا "امن اور سلامتی" ہے۔ اسی طرح "کفر" کے معنے "منھ پھیر لینا" یا "انکار کرنا" ہے "سر جھکانے" سے مطلب "صداقت کے سامنے سر جھکانا" یعنی "حق پرستی" ہے۔ اور اسی طرح کفر "صداقت سے انکار کرنا" ہوا۔ لیکن "صداقت" خود ایک متنازعہ فیہ شے ہے اور قطعی طور پر یہ فیصلہ کر دینا کہ کون سا اصول

بالکل حق ہے تقریباً محال ہے۔ ایسی صورت میں ہر شخص مجاز معلوم ہوتا ہے کہ جو بات اُسکی سمجھ میں آئے اُسکا اقرار کرے ورنہ انکار کر دے۔ پس کفر و اسلام کی تفریق اس طرح پر کہ انسان بمقابلہ ایک کے دوسرے کو تخیلات کرنے کے لئے مکلف اور مجبور سمجھا جائے صریح زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر شخص کے لئے وہی اسلام ہے جس پر اُسکا یقین اور ضمیر گواہی دے اور اُسکے خلاف کفر ہے۔ پس علاوہ اسکے کہ کفر و اسلام کی تفریق خود ایک اعتباری تقسیم ہے، ہر فرد بشر کے لحاظ سے بھی اُسکا معیار جداگانہ قرار دینا پڑیگا۔

اب اگر ہم دوسرا راستہ اختیار کریں اور یہ کہیں کہ احکام فطرت کی اطاعت کرنا اسلام ہے اور اُن سے سرتابی کرنا کفر ہے تو یہ بھی پہلے مفہوم کو گویا دوسرے الفاظ میں ادا کرنا ہے اور وہی بحث "احکام فطرت" کی بابت بھی کیجا سکتی ہے جو "صداقت" کے متعلق کی گئی ہے مجبوراً طبیعت تقاضا کرتی ہے کہ اسلام اور کفر کے عام اطلاق کے لئے صرف "اقرار" یا "انکار" یا "اطاعت" اور "نافرمانی" کافی نہیں ہے۔

قرآن پاک میں جہاں سے یہ دونوں اصطلاحیں لی گئی ہیں سب سے پہلے

کفر کا اطلاق شیطان پر ہوا ہے۔ جیسا کہ مرقوم ہے اَبیٰ وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ؕ یعنے "شیطان نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا تو وہ کافر قرار پایا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز کفر کے لئے لازم ہے وہ تکبر ہے نہ کہ محض انکار یا کسی حکم کی خلاف ورزی۔ خود قرآن پاک ہی سے ثابت ہے کہ حضرت آدمؑ نے بھی جان بوجھ کر نافرمانی کی اور شجر ممنوع کا پھل کھا کر مورد عتاب ہوئے مگر رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا یعنے "اے پروردگار ہم نے اپنے اوپر زیادتی کی" کہکر اپنے کو ہلاکت سے بچا لے گئے۔ اسی طرح "عرض امانت" کے موقع پر زمین آسمان اور پہاڑ سب نے اس بار گران کو اُٹھانے سے "انکار" کیا لیکن چونکہ اُن کا انکار عجز اور اظہار معذوری کے ساتھ تھا اس لئے کفر کا اطلاق نہیں ہوا۔ لطف یہ کہ حضرتِ انسان نے ہمت کی اور تحفظ امانت کا وعدہ کیا تو "ظالم" اور "جاہل" قرار پائے۔

یہاں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے کہ تمام مخلوق میں بڑھکر قدم مارنا اور حفظ امانت کی ذمہ داری کا دعویٰ کرنا انسان کی خود پسندی اور خود نمائی کی دلیل تھی۔ خیریت گذری کہ ابتدا اُسی طرف سے ہوئی تھی اور انسان نے صرف مالک کے خطاب کرنے پر حامی بھری تھی ورنہ

معلوم نہین کہ اور کیا کچھ ارشاد ہوتا ہے

سن کے چپ ہو اگر عتاب کرے
ورنہ کیا جانے کیا خطاب کرے

بہرکیف اسلام کے لئے تواضع اور اخلاص لازمی ہے۔ اور کفر صرف تکبر اور ریا کا نام ہے۔

اس مسئلہ کو تھوڑا اور واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پھر انسان بلکہ کل کائنات کی تخلیق کا منشا رہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق کی معرفت حاصل کی جائے۔ اسی لئے ہر چیز کی فطرت مین "طلب معرفت" ودیعت کی گئی ہے۔ تمام کائنات یا کم سے کم اس کرہ زمین پر انسان نے سب سے زیادہ مراتب ارتقا کو طے کیا ہے اور اس وجہ سے معرفت کی ذمہ داری بھی سب سے زیادہ اسی کے سر ہے۔ پس فطرت کا فرض ادا کرنا یعنے عرفان اور کمال کی ہر آن جستجو کرتے رہنا اسکے لئے لازم ہے۔ طلب ہمیشہ احتیاج کے احساس کے ساتھ وابستہ ہے اور اپنے کو محتاج سمجھنا گویا اپنی موجودہ حالت کی پستی اور اسکے ناکافی ہونے کا اقرار کرتا ہے اور یہی عجز و انکسار ہے جس کا نفس کے اندر پیدا ہونا اور قائم رہنا حصول کمال کے لئے

ضروری ہے اگرچہ دشوار ہے۔ اسی کے مقابلہ مین کبر و نخوت انسان سے
طلب کو زایل کرتی ہے اور کفر کی جانب لیجاتی ہے۔
مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ انسان کس کے مقابلہ
مین غرور کر سکتا ہے۔ خدا کے مقابلہ مین انسان کا تکبر نہ کوئی ہستی رکھتا ہے
نہ قابل لحاظ ہے بلکہ ایک بے معنے شے ہے۔ اس لئے کہ غرور نفس کا
خاصہ ہے اور نفس انسانی کسی حالت مین اس حقیقت کے احساس سے
غافل نہین ہو سکتا کہ اس عالم مین فطرت کے اختیارات بہت وسیع ہین
اور اُسکے قابو سے اکثر باہر ہین۔ شیطان بھی جس غرور پر کافر گردانا گیا وہ
بھی جناب باری کے مقابلہ مین نہین تھا بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے
مقابلہ مین تھا جس کا اظہار اُس نے یون کیا تھا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ
خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ یعنی "تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور حضرت آدمؑ کو
مٹی سے بنایا پس مین اُس سے افضل ہون" یہان بھی خدائے پاک کے
خالق ہونے کا اُس نے اقرار کیا مگر آدمؑ کے مقابلہ مین نخوت ہی سے
پیش آیا۔ پس تکبر یا تو کسی مخلوق کے مقابلہ مین ہو سکتا ہے یا اجمالی
طور پر نفس کے اندر اس کیفیت کے پیدا ہونے کا نام ہے کہ جس مرتبہ پر

خواہ بلحاظ عقل و شعور کے خواہ بلحاظ فضائل اخلاق کے خواہ بہ لحاظ اور محاسن کے ہم اسوقت فائز ہین اُس سے برتر کوئی مرتبہ نہین ہے خاصکر رسائی ذہن و عقل کو کافی سمجھ لیناسب سے زیادہ باعث گمراہی ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام امام محمد غزالیؒ نے جہان کفر و اسلام کی تفریق کی ہے وہان نہایت خوبی کے ساتھ کفر کو اس طرح محدود کیا ہے کہ جو شخص جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس چیز مین جھٹلائے جو خدا کی جانب سے اُن پر نازل ہوئی اور کسی قسم کی تاویل کو روا نہ رکھے وہ کافر ہے۔ یہان جس لفظ کو خاص اہمیت ہے وہ "جھٹلانا" ہے اور اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو نہ صرف جھٹلانا بلکہ ہر قسم کی سوء ادبی جنابؐ کی شان مین گمراہی اور ضلالت ہے۔ مین اس موقع پر بھی کسی مذہب کی خصوصیت نہین کرنا چاہتا بلکہ ہر شخص خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو آنحضرتؐ کے اجتماعی اور انفرادی حالات زندگی کو معلوم کرنے کے بعد غور کرے کہ کیا راہِ حق کے ایسے رہنما اور منزلِ عرفان کے اِس ہادی یکتا صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا بغیر شائبۂ کبر و نخوت کے ممکن ہے؟۔

مذہب اسلام نے اس بارہ میں نہایت صحیح راستہ اختیار کیا ہے
اور لِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ اور لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ کی
تعلیم دیکر تمام رہبرانِ طریقت اور بانیانِ مذہب کے حق مین کسی قسم
کی گستاخی کو مذموم قرار دیا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ جن لوگون نے
بنی نوع انسان کی فلاح اور اصلاح مین اپنی زندگی کو صرف کیا ہے
اور اخلاص و ایثار کے بیش بہا نمونے پیش کئے ہین اُنکی نیت اور
ارادہ کی تنقید کرتے ہوئے یہ احتیاط لازم ہے کہ ہم خود اپنی نیت اور
خیال کو خودنمائی اور خودپسندی سے پاک کرلین۔

یہ کوئی عجیب بات نہین ہے کہ مذہبی عقائد کے متعلق ہمارے ذہن
مین خطرات اور شبہے پیدا ہون اور جو بات ہماری سمجھ مین نہ آئے یا
جن کی بابت کوئی تشفی بخش حجت ہم تک نہ پہونچے ہم کو اُسکے تسلیم کرنے
مین رُکاوٹ پیدا ہو۔ ایسی حالت مین انکار جو اقرار قصور کے ساتھ ہو
کفر کی حد تک نہین پہونچ سکتا۔ انسانی ذہن کی رسائی کے حدود ہین
اوران حدود مین برابر وسعت ہوتی رہتی ہے۔ پس کسی وقت مین
ان حدود کو کافی یقین کرلینا میدان ترقی مین سدّ راہ ہوتا ہے۔ اور

یہی کبر و کفر ہے۔ البتہ جہان تک کہ عمل کا تعلق ہے کسی کو اسکی وسعت سے زیادہ تکلیف نہ دی گئی ہے نہ دی جا سکتی ہے۔

اسلام اور کفر کی اس تفریق کے بعد ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جہان ہر کیفیت اور ہر حالت کے مدارج ہین وہان یہ دونون چیزین بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہین ہین۔ اسلام کی ابتدا تو اضع ہے اور کفر کی انتہا تکبر ہے۔ اس کے بعد دونون کے مراتب ہین۔ مثلاً خدا کی دی ہوئی نعمتون کا شکر نہ بجا لانا یعنی فطرت کے پیدا کئے ہوئے وسائل کو اپنے مصرف مین نہ لانا یا سعی نہ کرنا کفران نعمت ہے۔ اسی طرح حقائق کی تفتیش و تلاش اور منازل ترقی کو طے کرنے کے لئے جدید وسائل کو کام مین لانا تقاضائے اسلام ہے۔

(۸)

دعوتِ عمل

اب مجھے صرف ایک آخری گذارش کرنا ہے اور وہ "دعوتِ عمل" ہے ۔ میرا خطاب خاص طور پر اُس جماعت سے ہے جو جذبہ اسلام کی مدعی اور خیر الامم کہلانے کی اپنے کو مستحق سمجھتی ہے ۔ اور ان مین سے بھی بالخصوص اُن نوجوانون کو مین مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو آئندہ کارزارِ زندگی مین داخل ہونے کی تیاریان کر رہے ہین ۔

اکثر مجالس مین جب یہ مسئلہ پیش ہوتا ہے کہ مسلمانون کی موجودہ پستی کی اصلیت کیا ہے؟ تو یہ ایک عام جواب ملتا ہے کہ ہم سچے مسلمان نہین رہ گئے ۔ اس جواب مین جو کچھ بھی وزن ہو لیکن یہ میرا تجربہ ہے کہ کہنے والے اور سُننے والے دونون کے ذہن مین اُس وقت "سچے مسلمان" کا نہ تو کوئی صحیح اور واضح مفہوم موجود ہوتا ہے اور نہ کوئی اُن اعمال کی تفصیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو "سچے مسلمان"

کے لئے ضروری ہین - ہماری سوسائٹی کی تربیت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ یہ جو اب مُسکت فرض کر لیا جاتا ہے - یا زیادہ ضرورت سمجھی گئی تو پنجوقتہ نماز با جماعت اور تیس دن کے روزے، اور اگر استطاعت ہو جس مین قرض لے سکنے کی قابلیت بھی مقدر ہے تو حج بھی - یہ وہ چند اعمال ہین جن پر وقتاً فوقتاً تاکید و تہدید کرتے رہنما رہنمایانِ ملت کو اُنکے فرض سے سبکدوش کر دیتا ہے -

زیادہ افسوسناک جو بات ہے وہ یہ ہے کہ جو تعلیم گاہین نہایت زور و شور کے ساتھ مذہبی تعلیم کی مدعی ہین اور اسی کے ساتھ نئی نسل کو میدان ترقی مین دوسری قومون کے مقابلہ کے لئے تیار کر رہی ہین وہان بھی کارکنون کے ذہن مین اس سے زیادہ اسلامی تربیت کا مفہوم نہین معلوم ہوتا کہ طلبار کو بعض فقہی مسائل ازبر کرا دئے جائین یا پانچون وقت نماز با جماعت کی تاکید کر دی جائے - اور عجیب تر یہ بات ہے کہ سربرآوردہ جماعت مین مشکل ہی سے چند نفوس ایسے ہونگے جو طلبائے کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کرتے ہون -

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

میرا یہ مطلب نہین کہ روزہ یا نماز فرض نہین ہے لیکن یہ ایک قابل غور حقیقت ہے کہ کیون عام طور پر قلوب مین سے ان چیزون کی وقعت کم ہوگئی؟ مین اُن لوگون مین سے نہین ہون جو صرف قرب قیامت کے خیال سے اپنے کو تسکین دے سکون مجھے جو بات صاف اور واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ تیرہ سو برس کی فرسودگی نے ان چیزون کو حقیقی لذت سے دور کردیا ہے اور محض ظاہر پرستی اور رسمی پابندی نے دلون کو اندر ہی اندر ان سے بیزار یا کم سے کم بے پرواہ کردیا ہے۔ ؎

سچ کہدون اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنمکدہ کے بُت ہوگئے پُرانے

مین عمداً ان چیزون کی طرف اسوقت دعوت بھی نہین دیتا لیکن جو لوگ اس فرض کے ادا کرنے مین مصروف ہین اُنھین اِس خطرہ سے آگاہ کردینا چاہتا ہون کہ اگر اُنھون نے اس عروسِ کُہن سال کو از سرِ نو جلوہ آرا نہ کیا اور بجائے ظاہری نمود اور حسن صورت کے اُس کی حقیقی خوبیون یعنی سیرت کا اعلان نہ کیا اور عملی نمونے

کامیاب زندگی کے پیش نہ کئے تو یہ نمالیشی عشاق کا گروہ بھی بہت جلد الوداع کہنے والا ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ مسلمانون مین اب بھی ایک خاصی تعداد ایسے لوگون کی موجود ہے جو دکھلانے کے لئے یا دل سے ارکان مذہبی کے پابند ہین لیکن جو نکبت اور بدبختی تمام مسلمانون پر طاری ہے اُن سے وہ بھی مستثنیٰ نہین ہین۔ پس اگر "ترک پابندی اسلام" مسلمانون کی پستی کا باعث ہو تو ہم کو ماننا پڑیگا کہ اسلام ان مراسم سے بالاتر کوئی چیز ہے جو ارکانِ دین کہلاتے ہین حقیقت یہ ہے کہ دین اور ایمان یا اسلام بمنزلہ ایک عمارت کے ہے اور روزہ، نماز وغیرہ رُکن یا ستون ہین جن سے اُس عمارت کو قائم رکھنا مقصود ہے۔ اس تیرہ سو برس کی مدت مین رفتہ رفتہ مسلمانون کے ذہن سے اصلی عمارت کا نقشہ بالکل محو ہو گیا اور بنانیوالون نے صرف ستونون کی تعمیر پر زور دیا اور اسی کی تاکید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلے کے محلے کھنڈر تعمیر ہو گئے مگر ایک عمارت بھی پوری نہوئی پھر کوئی وجہ نہین کہ لوگون کو اس بے نتیجہ تعمیر سے روبروز دلچسپی

کم نہوتی جائے۔

موجودہ زمانے مین مسلمانون کی حالت پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے سامنے کوئی مستقل اور واضح معیار زندگی موجود نہین ہے اور نہ اُن کو اپنی اجتماعی اور بسا اوقات انفرادی زندگی کا کوئی دلکش مقصد نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عام ہیجان اور انتشار کی حالت طاری ہے۔ اور اس پریشانی کے عالم مین جب دوسرون کی ترقیون پر اُن کی نگاہ پڑتی ہے اور اپنے کو نہ صرف پست اور ذلیل پاتے ہین بلکہ دوسرون کا تختۂ مشق بھی بننا پڑتا ہے، تو قدرتاً اُن کے دلون مین خود مذہب کی جانب سے شبہہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایسی حالت مین یہ کہکر کہ الدنیا سجن المؤمنین وجنة الکفرین یعنی "دنیا مومن کے لئے قیدخانہ اور کفار کے لئے بہشت ہے" اگر تشفی بھی دیجاتی ہے اور دنیا کی مصیبتون کے عوض مین آخرت کی نعمتون کے وعدے بھی یاد دلائے جاتے ہین تو مصداق "نقد را بہ نسیہ گذاشتن کار خردمندان نیست" بہت کم نفوس اس انتظار اشد من الموت کی کلفت گوارا کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہین۔

اس جگہ بطور جملۂ معترضہ کے یہ کہہ دینا چاہتا ہون کہ مذکورۂ بالا قول یعنی "دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے بہشت ہے" خود مسلمانون کے سامنے ایک معیار زندگی پیش کرتا ہے لیکن اس قول کے بے محل استعمال اور بیجا اطلاق نے اُس معیار کو خواہ مخواہ المناک بنا دیا ہے۔ بہشت کی زندگی ایک طرح پر بےفکری اور آرام کی زندگی ہے ۔ پس اس دنیا مین بہشت جیسی زندگی بسر کرنے والا یعنی بے خبر اور بےفکر رہنے والا کفران نعمت کرتا ہے اور اُس کا شمار کافرون مین کیا گیا ہے ۔ اسی طرح قید خانہ کی زندگی پابندی اور مشقت کی زندگی ہوتی ہے ۔ پس بندۂ مومن کی یہ شان ہے کہ وہ اس دنیا مین اصول فطرت کی پابندی اور حوادثِ عالم کے مقابلہ مین بامشقت زندگی بسر کرے اور اپنی ہستی کو ذلت اور پستی سے محفوظ رکھنے کی سعی مین مصروف ہو ۔

جو کچھ ان اوراق مین بیان کیا گیا ہے اُسکا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ہماری ارتقائی زندگی کا تمام دار و مدار منازل عرفان کے طے ہونے پر ہے اور یہی تقاضاے فطرتِ انسانی بلکہ منشاے تخلیقِ کُل

کائنات ہے۔ حصول عرفان مشاہدات اور تجربات سے وابستہ ہے۔ مشاہدات ظاہری اور باطنی دونوں حقیقت شناسی مین مدد کرتے ہین۔ مذہب اور فلسفہ دونون کی غایت بھی یہی تحصیل معرفت ہے۔ مذہب اور فلسفہ کے درمیان فرق امتیازی یہ ہے کہ ایک کا تعلق باطن سے ہے اور دوسرے کا ظاہر سے ہے۔ جن کیفیات کا احساس عام ہے وہ بیشتر عالم ظاہر سے متعلق ہین اور فلسفہ ان تمام کیفیات کی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ جن مخصوص نفوس کو کسبی یا وہبی طریقہ پر عام خلقت انسانی کے مقابلہ مین غیر معمولی قوتِ نظر و فکر حاصل ہے اُنپر جو کیفیات منکشف ہوتی ہین وہ صرف عالمِ باطن سے واسطہ رکھتی ہین اور مذہب صرف انھین حقائق سے بحث کرتا ہے۔ لیکن ظاہر اور باطن کا فرق بھی صرف اعتباری ہے اس لئے کہ انسانی قوتِ ادراک مین ارتقا ہے اور جو باتین ایک وقت مین عام طور پر فہم انسانی سے دور ہوتی ہین وہ کچھ عرصہ کے بعد بخوبی سمجھی اور سمجھائی جاسکتی ہین۔ اسی طرح نکات مذہب جو ایک وقت مین مُعَمّا معلوم ہوتے ہین دوسرے وقت مین فلسفیانہ دلائل اور

مثالون کی مدد سے سمجھ مین آسکتے ہین - پس نتیجہ ان تمام قضیون سے یہ نکلتا ہے کہ بلا تفریق مذہب اور سائنس کے بمصداق "الحکمۃ ضالۃ المؤمن" ہر ذریعہ سے حکمت اور معرفت کو حاصل کرنا ہمارا فرض ہے -

موجودہ زمانے کی مذہبی تعلیم مین جو نقص مجھے نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ مذہب سے بیگانہ کرنے والے علوم تصور کر لئے گئے ہین - یہ حالت مسلمانون پر اسوقت بھی گذر رہی تھی جب ابتدائے زمانۂ اسلام مین یونانی علوم نے مسلمانون مین رواج پکڑنا شروع کیا تھا - لیکن چونکہ اُس زمانے کی حکومت نے ان علوم کی سرپرستی کی اور حکومت بھی اسلامی تھی اس لئے رفتہ رفتہ علماے مذہب اور پھر جمہور کی وحشت ان علوم سے جاتی رہی اور تھوڑے ہی دنون مین خود فلسفہ کے ساتھ مسلمانون کو اتنا شغف پیدا ہو گیا کہ یونانی علم و حکمت کے تمام دنیا مین علمبردار بن گئے اور بجاے مردود قرار پانے کے فلسفہ مذہبی تعلیم کا ایک ضروری جزو ہو گیا - زمانۂ حال مین یہ دقت ضرور ہے کہ حکومت ایک بیگانہ قوم کے ہاتھ مین ہے جس کو

مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہین ہے۔ اور اگرچہ حکمران قوم اپنی جگہ پر
سائنس وفلسفہ کی بہت بڑی سرپرست بھی ہے لیکن اُسکو اس بات سے
چندان دلچسپی نہین کہ محکوم قومین علوم جدیدہ کو کس نگاہ سے دیکھتی ہین
اور آیا ان کو حقیقی معنے مین کوئی گہرا تعلق ان علوم کے ساتھ موجود ہے
یا نہین۔ جب تک کہ حکومت کے سیاسی اغراض کے لیئے کافی تعداد
رسمی تعلیم یافتہ لوگون کی مل سکتی ہے کوئی وجہ نہین ہے کہ وہ زیادہ
ذمہ داری اپنے اوپر لینا گوارا کرے۔ منجملہ اور اسباب کے حکومت
کی یہ بے پروائی خاص طور پر اُس بیگانگی کا باعث ہے جو ہندوستانیون
مین عموماً اور مسلمانون مین خصوصاً زمانۂ حال کی سائنس کے ساتھ
پائی جاتی ہے۔

جن ممالک مین اسلامی حکومتین دنون پہلے تھی یا اب ہر وہان
کی حالت بھی ہندوستان کے مقابلہ مین اچھی نہین ہے۔ اسکا باعث
کچھ تو ان سلطنتون کی اندرونی کمزوری تھی جس کی وجہ سے حکومت
نے مذہبی جماعت کی متعصبانہ مخالفت کی ہمت نہین کی اور کچھ خارجی
سیاسی پیچیدگیان تھین جنھون نے اندرونی ضرورتون کے احساس

اور نقائص کے اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کا کم موقع دیا۔ بہرکیف
خواہ اسکا سبب کم ہمتی ہو یا گذشتہ تیز رفتاری کی تکان، اندرونی
کمزوریان ہون یا خارجی مشکلات، ایک مرتبہ ترقی کی دوڑ مین سُست
پڑجانے کے بعد آجتک مسلمان بلحاظ علوم و فنون کے دوسری قومون
سے بالکل پیچھے ہی رہے۔
لیکن باوجود ان دشواریون کے جو حکومت کی بے نیازگی یا دُنیا
کے ہر گوشہ مین مسلمانون کی علمی پستی اور سیاسی تنزلی سے پیدا
ہوگئی ہین مجھے مسلمانون کی طرف سے نا امیدی نہین ہے اور اُسکا
سبب ہے۔ زمانۂ موجودہ کے تمام مذہبون مین صرف اسلام ایک ایسا
مذہب نظر آتا ہے جس کے پیرو اب بھی اپنے اندر سب سے زیادہ
مذہبی جذبہ رکھتے ہین اور اپنے مذہب کے لئے سب سے زیادہ
ایثار کرسکتے ہین۔ اگر ایک مرتبہ اُنپر یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ
علوم و فنون کی ترقی نہ صرف دنیاوی لحاظ سے بلکہ خالص مذہبی
اغراض کے لئے بھی اشد ضروری ہے اور مثل دوسرے فرائض مذہبی
کے یہ بھی ایک فرض ہے اور کیا عجب ہے کہ حالات زمانہ کے لحاظ

سے اہم ترین فرض ہو۔ تو کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی کہ اُنکو زمانۂ حال کے علوم و فنون مین وہی انہماک اور دلچسپی نہ پیدا ہو جائے جس کی شہادت پچھلی تاریخون سے ملتی ہے۔

مین نے اس سے پہلے یہ بات واضح طور پر بیان کرنیکی کوشش کی ہے کہ حقیقت شناسی صرف مشاہدات نفس یا انکشافات باطنی ہی تک محدود نہین ہے بلکہ حقائق کی تلاش خواہ اصطرلاب، دُوربین، خوردبین، تھرمامیٹر، ترازو اور بجلی ناپنے کی مشینون سے کیجائے یا مراقبہ اور کثرت ذکر و فکر سے خواہ حواس ظاہری کے ذریعہ سے ہم کوشش کرین یا حواس باطنی سے ہم مدد لین، یا جیسا کہ واقعہ ہے دونون کی مشترکہ سعی کو کام مین لائین ہر حالت مین ہماری یہ تلاش و کوشش عبادت ہے اس لئے کہ طلب حق ہے۔ اس مین کوئی شبہہ نہین کہ حصول عرفان مین مشاہدات باطن بمقابلہ سائنٹفک تحقیقات یعنی مشاہدات ظاہری کے کہین زیادہ اہمیت رکھتے ہین مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہین کیا جا سکتا کہ باطنی انکشافات عموماً انفرادی طور پر ترقی مین مدد دیتے ہین۔ برخلاف اسکے ظاہری تجربات سے

جو نتیجے پیدا ہوتے ہین اُنکا اثر عام بنی نوع انسان کی ذہنی اور مادی ترقی پر پڑتا ہے۔ اگر کسی وقت یہ سوال کیا جائے کہ آیا اُس ڈاکٹر یا حکیم کا مرتبہ زیادہ ہے جس نے کونین کے افعال وخواص دریافت کئے ہین یا اُس صوفی صاف باطن کا جو گوشۂ خانقاہ مین بیٹھا ہوا سیر فی اللہ کے مزے لے رہا ہے تو دونون کے درمیان موازنہ کرنا نہایت دشوار ہوگا لیکن مرزا غالب نے اپنے خاص بیان کے انداز مین جس خیال کا اظہار اس شعر مین کیا ہے وہ سرسری نہین ہے۔

وہ زندہ ہم ہین کہ ہین روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاودان کے لئے

اور یہی سبب ہے کہ صاحب سلوک وارشاد زیادہ واجب التعظیم قرار دئے گئے ہین۔

مسلمانون کے مخصوص نقطۂ نظر سے علوم جدیدہ کی تحصیل اور اُن مین عملی ترقی ایک اور بھی اہمیت رکھتی ہے۔ منجملہ فرائض مذہبی کے جہاد ایک نہایت اہم فرض ہے۔ جہاد کا مقصد اس سے زیادہ

کچھ نہین ہے کہ حق کی تلاش اور اُسکی حمایت مین انسان ہر قسم کی جہد وکوشش، سعی وایثار سے کام لے حتیٰ کہ اپنی ناچیز ہستی کو بھی فنا کر دینے سے دریغ نہ کرے - زمانۂ گزشتہ مین قومون کے درمیان کارزار زندگی کا فیصلہ زیادہ تر تلوار سے ہوا کرتا تھا اور درمیانی مراتب بہت تھوڑے تھے لیکن اب زمانے کے ساتھ صلح وجنگ کی صورتین بھی بدل گئین - مقابلہ کی ابتدا معاشرت وتمدن، ذرائع کسب معیشت وتجارت یعنی علم وہنر کے وسیع میدان مین ہوتی ہے اور واقعی جنگ کی نوبت آنے سے بہت پہلے شکست وفتح کا فیصلہ ہو جاتا ہے - اس صورت مین بجاے قَاتِلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ کے محدود اور مختص الوقت حکم کے جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ کے وسیع معنی پر ہم کو نظر ڈالنا چاہئے اور ہر آن وہر لحظہ اپنے دست وبازو، نظر وفکر، جسم وروح کو جہاد مین مشغول رکھنا چاہیے -

اگر ابتلاے عام اور مغلوبی کے موقع پر جہاد کا ناگزیر فرض کسی قوم پر عائد ہوتا ہے تو حالات زمانہ کے لحاظ سے اِسوقت سبسے

زیادہ اہم کوئی دوسرا موقع نہین ہو سکتا۔ مجھے خود یہ منصب نہین حاصل ہے لیکن یہ عجیب بات نہین ہو گی اگر کوئی زمانہ شناس مفتی نئے عنوان سے جہاد کا اعلان کرے اور مسلمانون کو شرکتِ عمل کی عام دعوت دے۔

یہان پہونچکر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر روحانی اور مادی ترقی دونون یکسان حصول معرفت مین معاون ہین اور حوادث عالم کا مقابلہ خواہ مادی ذرائع سے کیا جائے یا روحانی وسائل سے دونون صورتون مین واقعی جہاد ہے تو کیا وجہ ہے کہ جو قومین اسوقت دنیا مین مادی ترقیون کے لحاظ سے سب سے آگے ہین وہ سب سے زیادہ صاحب عرفان یا خدا رسیدہ نہ سمجھی جائین؟ اور کیون وہ اُن نعمتون سے محروم سمجھ لی جائین جن کی بشارت اسلام دیتا ہے اور جن کا مستحق مسلمان صرف اپنے ہی کو سمجھتے ہین؟ اسکا جواب مختصراً یہ ہے کہ اسلام اور کفر مین جو فرق ہے اُسکے لحاظ سے ہر وہ شخص جو اسلام رکھتا ہے اُس معاوضہ کا مستحق ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس معنی مین مسلمانون کو من حیث القوم کوئی فوقیت

نہین حاصل ہے۔ البتہ جو بات قابل لحاظ ہے وہ صرف یہ ہے کہ کوئی شخص جو ترقی حاصل کرنے مین کوشش اور سعی کر رہا ہے اُس کا مقصود اصلی کیا ہے؟۔

اس وقت دُنیا مین جو قومین سائنٹفک تحقیقات اور علمی انکشافات مین مشغول ہین بیشتر اُنکا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ایک محدود جماعت یعنے اپنی قوم کو دنیا کی دوسری قومون کے مقابلہ مین زیادہ قوی اور توانگر بنائین۔ بلکہ ایک گونہ اُن کا انتہائے نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مادّی ترقیون کے ذریعہ سے دوسرون کو پست کرکے اپنا محکوم بنائین۔ یا بالفاظ دیگر اپنی قومی ہستی کے لئے دوسری قومون کی ہستی کو فنا کردین۔ اسلام ایک بالکل جداگانہ نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ اُس کا مقصد عام بنی نوع انسان کو بلا لحاظ ملک اور قوم کے حقیقت شناسی مین مدد دینا اور عام مساوات اور مواخات پیدا کرنا ہے۔ گویا ایک کی تمام کوشش اور محنت قوم کے لئے ہے اور دوسری کی صرف حق کے واسطے ہے۔ یہ ایک ایسی واضح تفریق ہے کہ اسکے بعد اس بارے مین

کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہین معلوم ہوتی -

یہان پہونچکر ہمارے سامنے ایک روشن اور دلکش معیار زندگی نمودار ہوجاتا ہے جسے اگر ہم چاہین تو اختیار کرسکتے ہین اور سچے مسلمان کہلانے کا اپنے کو مستحق بھی بنا سکتے ہین - مگر مجھے اس سے انکار نہین ہے کہ اگر محدود نظر سے دیکھا جائے تو اس زمانے کی ترقی یافتہ قومون کا نقطۂ نظر بھی اپنے اندر بہت کافی کشش رکھتا ہے اور ہر شخص آزاد ہے کہ دونون مین سے جس کو چاہے اختیار کرے - البتہ یہ نقطۂ نظر اسلامی نہین بلکہ قومی ہے -

اسلام ہر کام مین تواضع اور اخلاص کا تقاضا کرتا یعنی للٰہیت اور صداقت چاہتا ہے اور اتنا سمجھ لینے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر غور کرے کہ کیا مادی اور روحانی ترقی مین کوئی فرق باقی رہجاتا ہے؟ کیا خلوص نیت اور صدق ارادت کے ساتھ جو وقت ہم اپنا تحقیقات علمی اور مادی ہی ترقی کے عملی ذرائع کے بہم پہونچانے مین صرف کرینگے وہ حقیقی معنٰی مین روحانی ترقی کا سبب نہین ہوگا؟ کیا اس نیت اور ارادے کے بعد عبادت اور معرفت کا میدان

یت وسیع نہین ہوجاتا ہے؟ کیا جن آنکھون نے کوہ طور کی آتش فشانی مین تجلیات قدرت کا مشاہدہ کیا تھا اُنھین بیٹری کے شرارون یا ریڈیم کی شعاعون مین وہی جلوہ نہین نظر آسکتا؟ کیا آیت الٰہی صرف فُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ یعنے سمندر مین چلنے والے جہازون ہی تک محدود ہے اور ہوا پر دوڑنے والے ایروپلین ہین نہین ہے؟ -

اگر ان سوالون کا جواب میری منشا کے مطابق ہے تو کیا اسلامی فداکاری اس بات کی مقتضی نہین ہے کہ بالتخصیص صوفی یا فلسفی، عوام یا خواص کے ہر وہ شخص جو اپنے کو حقانیت اور اسلام کا شیدائی سمجھتا ہے صرف اعلاے کلمۂ حق کے لئے اس دعوت عمل پر لبیک کہے اور زمانۂ موجودہ کی علمی اور عملی ترقی مین پوری سعی و ایثار سے حصہ لے - یہان تک کہ اپنی موجودہ کمتر ہستی کو مٹا کر ایک برتر اور زیادہ شاندار زندگی حاصل کرلے؟ کسی نے خوب کہا ہے -

دہر مین مسلم ہے حق کی آزمائش کے لئے
تمغۂ ایمان نہین ملتا نمائش کے لئے

جہان تک مجھ سے ممکن تھا مین نے اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا۔ اس سے بہتر معیار زندگی کوئی دوسرا نہین ہو سکتا کہ ہم تلاش حق مین زندگی بسر کرین اور اُسی کی طلب مین جان دین جیسا کہ ارشاد پاک ہے :-

اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ

یعنی "ہماری دعائین اور ہماری قربانیان یہان تک کہ ہماری موت اور زندگی صرف حق کے واسطے ہے"

جس کا اس اصول پر عمل ہے وہی اسلام کا سچا پیرو ہے۔

(۹)

اعترافِ شکست

میرے ایک دوست کا صحیح مقولہ ہے کہ ہر تمہید اعترافِ شکست ہے۔ مصنف جب سب کچھ لکھ چکتا ہے تو اُسکی نظر اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر پڑتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کمی کو تمہید یا دیباچہ، تتمہ یا خاتمہ لکھ کر پورا کرے لیکن میری دانست مین اس سے بہتر کوئی صورت نہین معلوم ہوتی کہ اپنی غلطیون کا اعتراف کر لیا جائے۔

مین نہین جانتا کہ جو کچھ مین نے لکھا ہے، دوسرون کی نگاہ مین وہ دہریت ہے یا اسلام، الحاد ہے یا تصوف۔ البتہ مین اتنا جانتا ہون کہ مین نے طبیعت کے تقاضے اور پورے یقین کے ساتھ لکھا ہے۔ مین نے کوشش کی ہے کہ جہان تک ممکن ہو سہل عبارت مین اور اصطلاحون سے علیحدہ ہو کر اپنا مطلب بیان کر دون لیکن جیسا چاہیئے مین اس معاملہ مین اپنے کو کامیاب نہین تصور کرتا۔

اس کا سبب زبان اردو کی کم مایگی ہو یا میری بے بضاعتی، یا یہ سبب ہو کہ جن مطالب کو مین بیان کرنا چاہتا تھا وہ پورے پورے بیان ہی مین نہین آسکتے - بہرحال سبب جو کچھ بھی ہو مین اپنی جرأت کی معافی چاہتا ہون -

مین نے ان تمام اوراق مین کسی کتاب یا کسی مصنف کا حوالہ نہین دیا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا مطالعہ کتب محدود اور نامکمل ہے اور ان مضامین کے لکھتے وقت مین نے کسی مصنف کو اپنے پیش نگاہ بھی نہین رکھا ہے - جو کچھ لکھا گیا اسکا مین خود ذمہ دار ہون - میرا مطلب یہ نہین کہ مین نے کبھی کسی تصنیف سے استفادہ نہین کیا بلکہ برعکس اسکے مجھے تسلیم ہے کہ اگرچہ مین نے اُنھین خیالات کا اظہار کیا ہے جو میرے اپنے ہین مگر اُن مین سے اکثر دوسرون کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا نتیجہ ہین - خاص طور پر مین اُن بزرگان ملت کا ممنون ہون جن کے فیض صحبت نے بڑی حد تک مجھے تصحیح خیال مین مدد پہونچائی ہے -

مین نے ابتدا مین دعوی کیا ہے کہ مذہب اور فلسفہ مین کوئی

فرق نہین ہے اور انتہا تک اپنے یقین کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے - میرا ہی دل خوب جانتا ہے کہ مجھے کیا کیا کاوشین کرنی پڑی ہین۔ لیکن اگر باوجود اس کے مین ناکامیاب قرار دیا جاؤن تو مجھے کوئی شکایت نہین - مذہب اور فلسفہ کے درمیان ایک معنی مین اگر اتحاد ہے تو دوسرے لحاظ سے دوئی بھی موجود ہے - ایک فلسفی اور ایک صوفی دونون قانون قدرت کے مشاہدہ کرنے والے ہین لیکن ایک علت و معلول، سبب اور نتیجہ کے چکر مین پھنس کر رہ جاتا ہے اور دوسرے کو ان ہین آیات الٰہی کے کرشمے نظر آتے ہین - یہی امتیاز نظرِ انبساط کی جان اور روح عرفان ہے اور اسی نگاہ کی دو رنگی نے فلسفہ اور مذہب کو جدا کر دیا ہے -

فلسفی گشتی و آگہ نیستی ۔۔۔ از کجا و با کجا و کیستی
این حکیمان چون سبب آموختند ۔۔۔ چشم از آیاتِ قدرت دوختند
عشق را گفتند از قسمِ جنون ۔۔۔ استعذ باللہ مما یفترون

اس اعتبار نظر کو اٹھا دینے کے بعد دونون ایک ہین -

چونکہ اس حصہ مین بیشتر فلسفیانہ طریق استدلال سے کام لیا گیا ہے اس لئے اسکا نام بھی "قیل وقال" زیادہ موزون معلوم ہوتا ہے - دوسرا حصہ "ذکر وحال" کا تقاضا کرتا ہے - لیکن مین اپنے مین اسکی صلاحیت نہین پاتا - اس وجہ سے اگرچہ اس دوسرے حصہ کو لکھنے کا جی چاہتا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسکی نوبت نہ آئے اس لئے کوئی وعدہ نہین کرتا - اور کیا عجب ہے کہ میری کمی کو قدرت دوسرون کے ہاتھ سے پورا کرا دے - یا بغیر کسی تصنیف وتالیف کے مقصد پورا ہو جائے

باقی این گفتہ آید بے زبان
در زبانے ہر کہ دارد زندہ جان

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ - وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ هَدَانَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٥

(۱۰)

کارزارِ زندگی

یہ تن آسانی کہاں تک اے دلِ غفلت شعار؟
کب تلک آخر یہ شب کی پی ہوئی مے کا خمار؟

تا کجا یہ بیخودی اے مستِ صہبائے خودی؟
کب تلک یہ بیہُشی اے کبر و نخوت کے شکار؟

بات ہے وہ کون سی جس پر ہے تو بھولا ہوا؟
کون سی شی ہے تجھے جس پر ہے اتنا اعتبار؟

جھوٹ موٹ اک نفس کو تسکین دینے کیلئے
کیوں بنا رکھا ہے تہذیبِ گزشتہ کا مزار؟

جبکہ خود تجھ میں نہیں جوہر ترے اجداد کے
پھر سلف کے کارناموں پر یہ کیسا افتخار؟

کیا نہیں تو نے سنا ہمت کا حامی ہے خدا؟
کیا نہیں تجھکو خبر دنیا ہے جائے کارزار؟

لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلّاَ مَا سَعیٰ کو یاد رکھ
ایک اس قانون پر ہے سارے عالم کا مدار

کچھ دنوں غافل رہا گر یوں ہی اپنے حال سے
کچھ دنوں گر یوں ہی کھینچا اور تو نے انتظار

صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا تیرا نام تک
خاک میں مل جائیگا تو ہو کے گردِ روزگار

نیست کر ڈالے گی تجھ کو کارزارِ زندگی
پیس ڈالے گی تجھے یہ گردشِ لیل و نہار

سب فنا ہو جائے گا اک دن ترا کبر و غرور
ہوشیار اے بیخبر! کارِ جہاں سے ہوشیار!!

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۵	مجبور	مجبور ہین
رر	۷	موجوہ	موجو دہ
۵	۱۳	رفتہ	رفتہ رفتہ
۱۱	۳	مین	مین سے
۱۸	۱۱	اسباب	اس بات
۲۳	۲	نغیرات	تغیرات
۲۹	۱۰	دس ہزار	دس ہزار سال
۳۵	۷	اُسکی	اُنکی
۴۵	۱۱	کرور	کرورون
۴۸	۱۳	کرنا	کرتا ہے
۶۵	۱۱	عالم اجسام	عالم مین اجسام
۸۱	۱۰	نافوق الفطرت	مافوق الفطرت

اعلان

اس کتاب کی باضابطہ رجسٹری کرالی گئی ہے
کوئی صاحب بلا اجازت مصنف چھاپنے یا
ترجمہ کرنے کا ارادہ نہ کریں

قیمت فی جلد غیر مجلد ... ۱۲/
" " مجلد ... عہ/

تاجروں کے ساتھ خاص رعایت

المشتہر
مینیجر مطبع حکیم برہم گورکھپور